ماہنامہ
قلندر شعور
دسمبر ۲۰۲۰ء

سکون زندگی کی سب سے بڑی نعمت ہے
اور روح کے عرفان کے بغیر سکون نہیں ملتا

کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں...؟

جلد 8 شمارہ 11 | دسمبر 2020ء | ربیع الثانی ۔ جمادی الاوّل 1442ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ قلندر شعور کراچی

قلندر شعور

Neutral Thinking

(اردو ۔ انگریزی)

سرپرست اعلیٰ

حضور قلندر بابا اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

چیف ایڈیٹر

خواجہ شمس الدین عظیمی

ایڈیٹر

حکیم سلام عارف

سرکولیشن منیجر

محمد ایاز

باہتمام عظیمی یونیورسٹی پریس ۔ پبلشر شاہ عالم عظیمی نے ابن حسن آفسیٹ پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فی شمارہ 80 روپے.....سالانہ ہدیہ 1080 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ساتھ ، بیرونِ پاکستان 70 امریکی ڈالر سالانہ

B-54، عظیمی محلّہ، سیکٹر C-4 سرجانی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔ فون نمبر: 6912020 (0)213 92+

۳۸ مضامین کا گُل دان

حمد باری تعالیٰ ـــــــ جوہرؔ دیوبندی 10

نعت رسول مقبول ﷺ ـــــــ حسرتؔ موہانی 11

رباعیات ـــــــ ابدالِ حق حضور قلندر بابا اولیاؒ 12

آج کی بات ـــــــ مدیر مسئول 14

فقیر کی ڈاک ـــــــ ادارہ 18

نامے میرے نام ـــــــ خانوادہ سلسلہ عظیمیہ 20

لوہے سے ایجادات کا ظہور ـــــــ (M.A Fine Arts) حامد ابراہیم 25

کراچی ماں جیسا شہر ہے ـــــــ عابد محمود 31

ہر خوشی اک وقفۂ تیاریِ سامانِ غم ـــــــ ادارہ 35

پیراسائیکالوجی سے مسائل کا حل ـــــــ خواجہ شمس الدین عظیمی 41

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا ـــــــ (برطانیہ) صوفیہ رفعت 45

مضمون کا عنوان قارئین بتائیں ـــــــ (M.Sc. Botany) خالدہ زبیر 49

کِس نے کہا اور کِس نے سنا ـــــــ عرفانہ شہزاد 55

آدمی خود نہیں دیکھتا ـــــــ؟ ـــــــ (M.A Sociology) نفیسہ شاکر 61

یا اللہ! تیرا شکر ہے ـــــــ صبا محمود 65

اکتوبر 2020ء کے سرورق کی تشریح ـــــــ قارئین 70

یارب! میرے خامہ کو زباں دے ـــــــ (M.A IR) حماد علی شاہ 75

صلاحیت علم ہے ـــــ فرزانہ پرویز 81

دس ہزار برس پرانی ڈائری ـــــ (M.A Urdu) سید نوشاد کاظمی 87

دُہری شخصیت ـــــ (MBA) عثمان طاہر 91

اقتباسات ـــــ قارئین 95

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ـــــ نیّر اعظم 97

بلا عنوان ـــــ احمد ندیم 101

میں ہی نظر اور میں ہی منظر تھا ـــــ بی بی انورادھا 109

پورب کے ہم زاد ـــــ (M.Sc. Applied Physics) محمد عدنان خان 115

اللہ میاں کے باغ کے پھول ـــــ

اولی الالباب بچے ـــــ ادارہ 121

چشمہ ـــــ آگ اور پانی ـــــ (M.A Mass comm.) سارہ خان 123

ذہین بیٹا ـــــ بی بی ایمن 128

ننھی گلنار ـــــ (Ph.D.) ڈاکٹر نگہت حیات 131

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر ـــــ عظیمی خواجہ شمس الدین 135

A Beginner's Mind ـــــ Qasim Mehmood 145

The Fruit of Obedience ـــــ Roshan Sitara 147

Granny ـــــ Fatima Zubair 149

Body—The Appliance of Soul ـــــ Bibi Anuradha (UAE) 154

Arrival ـــــ Mahnoor Arif 157

Obsessive Thinking ـــــ Umar Tariq 162

Restlessness ـــــ Shazia Rasheed 168

Message of the Day ـــــ K.S.Azeemi 172

حمد باری تعالیٰ

جوہرؔ دیوبندی

تیری قدرت کے ہیں مظہر آبشار و کہسار
ذرّے ذرّے سے ہیں جلوے تیرے یارب آشکار
تیرے دم سے چاند اور تاروں میں پیدا ہے چمک
تیرے دم سے بلبلوں اور قمریوں میں ہے چہک
ہیں اشاروں پر ترے گردش میں ساتوں آسماں
ہیں ترے دم سے ہی قائم یہ جہاں اور وہ جہاں
تیری مرضی کے بنا پتّا بھی ہل سکتا نہیں
پھول تک بھی گلستاں میں کوئی کھل سکتا نہیں
تو اگر چاہے تو اڑ جائے گلستانوں میں دھول
تو اگر چاہے تو کھل جائیں بیابانوں میں پھول
تو بنا سکتا ہے پل میں بادشاہوں کو فقیر
اور بنا سکتا ہے دم بھر میں گداؤں کو امیر
اللہ اللہ شان تیری، طائرانِ خوش نوا
صبح دم ہوتے ہیں تیری حمد میں نغمہ سرا
ہر طرف ہے اہتمامِ جام و پیمانہ ترا
بادہ خواروں کے لئے ہے عام میخانہ ترا
کھل سکا جوہرؔ نہ جو وہ رازِ سربستہ ہے تو
محوِ حیرت ہے زمانہ میرے مولا کیا ہے تو

نعت رسولِ مقبول ﷺ

حسرتؔ موہانی

پھر آنے لگیں شہرِ محبت کی ہوائیں
پھر پیشِ نظر ہوگئیں جنت کی فضائیں

اے قافلے والو، کہیں وہ گنبدِ خضرا
پھر آئے نظر ہم کو کہ تم کو بھی دکھائیں

ہاتھ آئے اگر خاک ترے نقش قدم کی
سر پر کبھی رکھیں کبھی آنکھوں سے لگائیں

نظارہ فروزی کی عجب شان ہے پیدا
یہ شکل و شمائل یہ عبائیں یہ قبائیں

کرتے ہیں عزیزانِ مدینہ کی جو خدمت
حسرتؔ انھیں دیتے ہیں وہ سب دل سے دعائیں

پھر آنے لگیں شہرِ محبت کی ہوائیں
پھر پیشِ نظر ہوگئیں جنت کی فضائیں

مشیت کی لکیر

کل روزِ ازل یہی تھی مری تقدیر
ممکن ہو تو پڑھ آج جبیں کی تحریر
معذور سمجھ، واعظِ ناداں مجھ کو
ہیں بادہ و جام سب مشیت کی لکیر

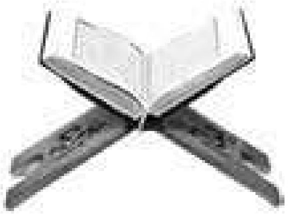

”جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ سب دفتروں میں درج ہے۔ اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے۔“ (القمر: ۵۲-۵۳)

اے واعظ! میں جس آقاؐ کا غلام ہوں، ان کا فرمانا ہے: ”قلم لکھ کر خشک ہو گیا۔“

آج میری پیشانی پر زندگی کی جو فلم رقصاں ہے وہ میری پیدائش سے پہلے ازل میں بن گئی تھی اور یہی میری تقدیر ہے۔ اے واعظ! تیرے وعظ و نصیحت کا میرے اوپر کیا اثر ہو گا، تو خود ازل کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔ یہ سب بادہ و جام کی باتیں بھی ازل میں لکھی جا چکی ہیں۔ یہ شراب (زندگی) اور یہ جام (خاک کے لباس سے مزّین یہ بدن) قدرت کی ایسی لکیر ہے جسے کوئی نہیں بدل سکتا۔

اے واعظ! یہ سعادتِ ازلی سعادت مندوں کو میسر آتی ہے۔ ازلی شقی اس کے قرب سے محروم رہتے ہیں۔ بالآخر ایک وقت آئے گا کہ یہ لکیریں (لہریں) منتشر ہو جائیں گی۔ گریویٹی (کششِ ثقل) کا دائرہ کار ختم ہو جائے گا اور آدمی کا جسم تحلیل ہو جائے گا۔

ہر اچھا یا برا عمل، کتاب المرقوم میں درج ہے۔ جس نے ذرّہ برابر نیکی کی اسے اس کا اجر ملے گا اور جس نے ذرّہ برابر برائی کی وہ بھی ریکارڈ ہے۔

تاریخ کے تمام ادوار بشمول ماضی اور مستقبل لوحِ محفوظ پر نقش ہیں۔ کائنات کا ہر ذرّہ اس نقش کی تفصیلی تصویر ہے۔ ہر ذرّے کے وجود کی گہرائی میں اسی نقش کا سراغ ملتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ذرّے میں اپنی زندگی کی فلم یا ریکارڈ موجود ہے۔ یہ ریکارڈ ذرّے کے اندر جھانکنے سے نظر آتا ہے۔ ذرّے میں موجود فلم یا ریکارڈ کا مشاہدہ کر کے آدمی ماضی اور مستقبل کے تمام واقعات سے باخبر ہو جاتا ہے۔

آج کی بات

تقریروں اور تحریروں کے ذریعے شماریات سے زیادہ مواقع پر متوجہ کر چکا ہوں کہ تلاش کریں آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی یہ مقام چھوڑنا پڑتا ہے، اس دنیا سے جانے کے بعد یہاں سے ربط ختم کیوں نہیں ہوتا اور یہ پورا نظام کون چلا رہا ہے کہ جس میں تبدیلی اور تعطل نہیں۔ روشن ذہن خواتین و حضرات اور بچوں نے حکم کی تعمیل کی اور اپنی اصل کی تلاش میں ہیں—— باقی بھول بھلیّوں میں کھوگئے ہیں۔ منزل پر پہنچنے کے لئے چلتے رہنا شرط ہے۔

مسافر منزل کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو راستے میں نشیب و فراز آتے ہیں، طوفان سے دوچار ہوتا ہے اور باد و باراں بھی رکاوٹ بنتے ہیں۔ عقل بند مسافر ان سے ٹکرانے کی کوشش کرتا ہے جب کہ عقل مند طوفان گزرنے کا انتظار کرتا ہے۔ انتظار بھی سفر ہے، قدم بظاہر کچھ وقت کے لئے رکے ہیں لیکن راستہ طے کرنے کے لئے اندر میں صبر، استقامت، امید اور یقین کا سفر جاری ہے۔ مسافر کی نظریں راستے پر مرکوز ہیں اور منزل ذہن میں نقش ہے۔ قدم رکنے کے باوجود سفر نہیں رکا، مسافر آگے بڑھنے کی تیاری کر رہا ہے۔ جیسے ہی طوفان تھمتا ہے، وہ چلنا شروع کر دیتا ہے۔

دوسرا مسافر نشیب و فراز پر برہمی ظاہر کرتا ہے، طوفان سے لڑتا ہے اور باد و باراں پر شکوہ کرتا ہے۔ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سب اس راستے کا حصہ ہیں جس پر مسافر چل رہا ہے۔ دونوں کا راستہ ایک اور منزل مخالف سمت میں ہے۔ طوفان اس راستے سے گزر کر اپنی منزل پر اور مسافر اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا ہے لیکن—— مخالف سمت سے آنے کی وجہ سے

رکاوٹ سمجھ کر مزاحم ہوجاتا ہے۔ اگر مسافر کے اندر طوفان سے زیادہ طاقت ہے تو گزر جائے ورنہ ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے اسے گزرنے دے۔

ایک مسافر نے اندر میں توانائی یکجا رکھی اور دوسرے نے غیر ضروری استعمال سے منتشر کردی۔ ایک نے طوفان کو راستہ دے کر اثر کو بے اثر کردیا۔ اس طرح اپنی سکت کے علاوہ طوفان کی مقداریں بھی اسے منتقل ہوگئیں۔ جب کہ دوسرے مسافر نے اثر قبول کرکے خود کو طوفان سے دوچار کردیا۔

• • ——————————— • •

مقصد سے غافل رہنا آدمی کو گمراہ کردیتا ہے۔ خالقِ کائنات کا ارشاد ہے:

''میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیا ہے
کہ وہ میری بندگی کریں۔'' (الذّٰریٰت: ۵۶)

اللہ نے جنات اور انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ سنت و فرض عبادات کے ساتھ کیئر آف اللہ طرزِ فکر اختیار کرنا کہ ہر شے اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

مخلوق کی تعریف بیان کی جائے تو کہا جائے گا کہ تقاضے جس پیمانے میں یکجا کئے گئے ہیں وہ پیمانہ مخلوق ہے۔ ہر پیمانہ مختلف ہے مگر بنیادی تقاضے مشترک ہیں۔ ایک طرف آدمی ضرورتوں کا پابند ہے اور دوسری طرف اس کی تخلیق کا مقصد عبادت ہے۔ غور کیا جائے تو دونوں کو ایک دوسرے سے نسبت ہے۔ احتیاج اسے خلقت کے دائرے میں رکھتی ہے اور ان کے پورا ہونے کے لئے خالق سے ربط عبدیت ہے۔

''ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں اور آپ سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں
صراط مستقیم کی ہدایت دیجئے۔'' (الفاتحہ: ۴۔۵)

تقاضے کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ قدرت تقاضوں کے ذریعے مختلف زاویوں سے ہمیں تکمیل کا پیغام دیتی ہے۔

مثال آدمی اطمینان سے بیٹھا ہوا ہے اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہے۔ پیاس لگتی ہے اور توجہ کچھ دیر کے لئے اخبار سے ہٹ جاتی ہے۔ اخبار ایک طرف رکھ کر گلاس میں پانی ڈالتا ہے اور سیراب ہو کر دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد پھر پیاس لگتی ہے اور بے چینی پیدا ہوتی ہے، دوبارہ پانی پی لیتا ہے۔ پیاس وقتی طور پر بجھتی ہے لیکن پھر تقاضا پیدا ہوتا ہے۔

تجزیہ اطمینان کی حالت میں جن تقاضوں کی آدمی کو ضرورت تھی، ان کی مقداریں جسم میں پوری تھیں۔ مقداریں اچانک کم ہوئیں جسے اس نے پیاس کا نام دیا اور سوچے سمجھے بغیر پانی پی کر دوبارہ اطمینان کی حالت میں آ گیا۔ اطمینان کیا ہے، مقداروں میں کمی کیسے آئی اور کس نے بتایا کہ یہ پیاس ہے۔ پانی پینے کے بجائے کھانا کیوں نہیں کھایا، دودھ یا قہوہ کیوں نہیں پیا۔۔۔؟ جواب یہ ہے کہ اسے خود نہیں معلوم کہ اس نے طبیعت میں ہیجان محسوس ہونے پر پانی کیوں پیا، چائے کیوں نہیں پی؟ تسکین اور تشنگی بندے کو اندر میں خلا کی طرف متوجہ کرتی ہے جو پانی پینے اور کھانا کھانے سے عارضی طور پر پُر ہوتا ہے لیکن کچھ دیر بعد دوبارہ پیاس لگتی ہے۔ فرد تقاضا ابھرنے پر بار بار پانی پینے کی زحمت کرتا ہے مگر نہیں سوچتا کہ پیاس کیوں لگتی ہے اور تکمیل کیسے ہو۔

تقاضے ہر تھوڑے وقفے کے بعد ابھر کر احساس دلاتے ہیں کہ ہماری تکمیل نہیں ہوئی، تم جن چیزوں سے ہمیں سیراب کر رہے ہو، وہ عارضی ہیں، ایک حالت پر قائم نہیں رہتیں، پھر ہماری تکمیل کیسے ہو سکتی ہے؟ ہر تقاضا تکمیل چاہتا ہے اور ہم اس کی تسکین کر کے کچھ دیر کے لئے خاموش کرا دیتے ہیں۔ یہی ہماری طبیعت ہے کہ ہم عارضی سہاروں پر تکیہ کرتے ہیں اور تکمیل کا راستہ تلاش نہیں کرتے۔ شاعر نے کہا ہے:

تمام عمر سہارے فریب دیتے ہیں　　　تمام عمر سہاروں پہ آس رہتی ہے

مرشد اور مرید ہم سفر تھے۔ پیاس لگتی تو کسی مقام پر رک کر پانی پی لیتے۔

مرید نے پوچھا، ہم پانی پی چکے ہیں پھر بار بار پیاس کیوں لگتی ہے ؟

مرشد نے فرمایا، ارے نادان! پیاس ظاہر ہو کر یہ نہیں بتارہی کہ تمہیں پیاس لگی ہے، وہ کہتی ہے میں پیاسی ہوں ___ میری تکمیل کرو۔

مرید کے قدم یک لخت رک گئے اور سوچا کہ صاحبِ طریقت کیا فرمانا چاہتے ہیں۔

محترم! پیاس میرے ذریعے اپنی تکمیل کیوں چاہتی ہے ؟

مرشد نے قریب پڑے پتھر پر بیٹھتے ہوئے فرمایا، کیوں کہ تم اپنی توانائی کے بجائے اس کی توانائی سے سفر کر رہے ہو۔ پانی پی کر پیاس بجھتی ہے، اور تم کہتے ہو میں سیراب ہو گیا؟

پوچھا، کیا یہ ایک بات نہیں ___؟ فرمایا، نہیں ___ بالکل نہیں! پیاس اور تم دو وجود ہو۔

عرض کیا، مجھے زندہ رہنے کے لئے پانی کی ضرورت ہے، پھر پیاس کی تکمیل کیسے ہو گی ؟

مرشد نے فرمایا، جب تمہاری تکمیل ہو جائے گی۔ اپنی سیرابی کے لئے عارضی سہارے مت تلاش کرو۔ آدمی روٹی سے نہیں، اس روشنی سے زندہ ہے جو لاشعور سے آتی ہے۔ تم نے روشنی نہیں دیکھی، اس لئے قدرت روشنی کو روٹی اور پانی کی شکل میں ظاہر کر کے تمہاری تسکین کرتی ہے اور تقاضے دہرا کر تمہیں متنبہ کرتی ہے کہ تسکین عارضی ہے۔ کیوں کہ پانی اور روٹی کی شکل عارضی ہے۔ پانی خشک ہوتا ہے، بخارات بن کر اڑتا ہے، بارش کی شکل میں برستا ہے اور سردی میں جم جاتا ہے۔ روٹی کی شکل بھی تبدیل ہوتی ہے لیکن روشنی ___ روشنی ہے۔ اسی روشنی سے دوبارہ پانی بنتا ہے۔

مرید نے عرض کیا، روشنی کہاں ہے ___؟

فرمایا، خود کو آئینے میں دیکھتے ہو، روشنی کو دل کے آئینے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

خواتین و حضرات قارئین! بتائیے یہ مضمون کس نے لکھا ___ کس نے پڑھا ___ لکھنے اور پڑھنے کے ملاپ سے مفہوم کی تصویر کہاں بنی ___؟ بہت شکریہ۔

اللہ حافظ

فقیر کی ڈاک

تفکر ــــ ذہن کی دنیا میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ تفکر سے خیال کی گہرائیاں روشن ہوتی ہیں۔
گہرائی میں تخلیقی رموز کے خزینے ہیں جن تک رسائی ــــ عرفانِ نفس اور معرفتِ الٰہی ہے۔
"فقیر کی ڈاک" اذہان کی آبیاری ہے جس میں مرشد کریم خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب ذہن
کے پرتوں کو کھول کر لاشعور کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

محترم و مکرم عظیمی صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

سوال یہ ہے کہ اگر روحانی علاج کے اثرات مرتب ہوتے ہیں تو ان کے پیچھے کون سے عوامل کام کرتے ہیں۔ نیز روحانی معالج کی تعلیم کیا ہونی چاہیئے؟ کیا یہ دوسرے طریقِ علاج کی طرح فائدہ مند ہے؟

شکریہ، عبدالحفیظ۔ برمنگھم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ،

انسانی زندگی تین دائروں میں تقسیم ہے۔ ① مادی ② ذہنی ③ ماورائے ذہنی

مادی دائرے کا تعلق طبیعیات سے ہے، ذہنی دائرے کا تعلق نفسیات سے ہے اور ماورائے ذہنی دائرہ مابعدالنفسیات یا پیراسائیکالوجی ہے۔ مابعدالنفسیات میں طبیعیات اور نفسیات سے ہٹ کر ان علوم کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو کائنات کے قوانینِ عمل کا احاطہ کرتے ہیں۔ علمِ مابعدالنفسیات اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ انسان کائنات کی تخلیق میں کام کرنے والے فارمولوں سے کس حد تک واقف ہے؟ کیا یہ فارمولے اس کی دسترس میں ہیں؟ ان فارمولوں کی تعداد کتنی ہے؟ انسانوں کے لئے ان کی افادیت کیا ہے اور ان سے آگاہی حاصل کر کے کس طرح زندگی کو خوش گوار اور کامیاب بنایا جاسکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ زندگی میں خوشی اور غم کا تعلق براہِ راست خیالات اور تصورات سے ہے۔

خیالات کیسے بنتے ہیں اور کہاں سے آتے ہیں؟

مابعد النفسیات کا قانون بتاتا ہے کہ انسان تین پرت کا مجموعہ ہے۔ ① ذات ② صفات ③ پرت جسدِ خاکی جو گوشت پوست کا وجود ہے، میں دو قسم کے نقوش ہوتے ہیں۔ ایک نقش باطن ہے جس کے اندر بہت لطیف انوار کا ذخیرہ ہے۔ کتاب ”لوح و قلم“ میں درج ہے کہ عرف عام میں رگ پٹھوں کی بناوٹ اور ہڈیوں کے ڈھانچے کو انسان کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ انسان وہ نہیں جس کو قدرت انسان کہتی ہے۔ گوشت پوست اور رگ پٹھوں سے مرکب وجود اصل انسان کا لباس ہے۔

مثال: اگر آپ چاہیں کہ قمیص جسم سے الگ حرکت کرے تو یہ ممکن نہیں۔ جب تک قمیص جسم کے اوپر ہے، جسم کی حرکت کے ساتھ اس کے اندر حرکت موجود ہے۔ اگر آستین ہاتھ کے اوپر ہے تو ہاتھ کی حرکت کے ساتھ آستین کا حرکت کرنا لازمی امر ہے۔ ہاتھ سے الگ آستین میں حرکت پیدا ہونا بعید از قیاس ہے۔

یہی حال جسم کا ہے۔ جسم کسی دوسرے جسم (روح) کے اوپر موجود ہے تو اس میں حرکت ہے ورنہ وہ بے حرکت ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ خاکی جسم انسان نہیں بلکہ اصل انسان کا لباس ہے۔ جب تک اصل انسان موجود ہے لباس بھی موجود ہے۔ جیسے ہی اصل انسان — لباس (جسم) سے تعلق منقطع کر لیتا ہے، مادی جسم کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔

زندگی معین مقداروں پر قائم ہے۔ مقداروں میں کمی بیشی یا شکست و ریخت سے زندگی غیر متوازن ہو جاتی ہے اور آدمی پریشانی، الجھن، بیماری، وسوسہ اور جادو ٹونے کے خیال میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ روحانی معالج غیر متوازن مقداروں کا مطالعہ کر کے مریض کے اندر کام کرنے والی مقداروں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

روحانی علاج ایک مکمل سائنس ہے۔ معالج اگر مقداروں کے توازن اور عدم توازن کے قانون سے واقف نہیں اور مقداروں میں ردّو بدل کا تجربہ نہیں رکھتا تو اسے معالج نہیں کہا جا سکتا۔ روحانی علاج کے لئے مکمل کورس پڑھنا ضروری ہے۔ ذہین طالب علم اس علم کو دس سال میں سیکھتا ہے۔ جس طالب علم کا شعور کمزور ہوتا ہے، وہ روحانی معالج نہیں بن سکتا۔ ذہن نشین رہے کہ روحانی استاد اور عامل میں فرق ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے کہ لوگ جانتے ہیں کہ ڈسپرین سر درد کی دوا ہے لیکن چند ادویہ کی معلومات کی بنا پر ہم کسی کو ڈاکٹر نہیں کہتے اور نہ ہی ایم بی بی ایس ڈاکٹر کو اسپیشلسٹ یا ایف آر سی ایس کہتے ہیں۔

دعاگو، عظیمی

نامے میرے نام

کرم فرما خواتین و حضرات نے ''ماہنامہ قلندر شعور'' کو دل کی گہرائیوں سے نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ قبول فرما کر روپ بہروپ کو دلہن کا روپ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قارئین کی خدمت کی توفیق دیں۔ رابطے کے قدیم و جدید وسائل کے ذریعے موصول ہونے والے خطوط میں سے منتخب خطوط شائع کئے جا رہے ہیں۔

اکتوبر 2020ء کے ''آج کی بات'' پر موصول شدہ تفکر میں سے منتخب خطوط:

گلِ نسرین (کلاس نظریۂ رنگ و نور): اکتوبر 2020ء کے '' آج کی بات'' پر تفکر کیا۔ تحریر میں مراقبہ ہال کی منظر کشی ہے اور لفظوں کے پیراہن میں قوانین مخفی ہیں۔ تفکر سے جو قوانین سمجھ میں آئے، پیشِ خدمت ہیں۔

۱۔ چاروں طرف سڑک ہے اور سڑکوں پر سڑکیں کراس کر رہی ہیں۔ اس کو پڑھ کر دائرہ اور مثلث ⊕ کی تصویر بنی۔ یہاں پر آنے والے افراد شعوری سڑک عبور کر کے لاشعور میں داخل ہوتے ہیں۔

۲۔ رنگ روپ اور نقش و نگار کی مناسبت سے کیفیات مختلف ہونے میں اشارہ ہے کہ ہر شخص ذہن کی ساخت کے مطابق دیکھتا ہے۔ اپنے ذہن کے دیکھنے سے حقیقت پردہ بن جاتی ہے اور جس مقام پر ہم موجود ہیں، اس مقام کے ذہن سے مقام کو دیکھیں تو پردہ ہٹ جاتا ہے۔

۳۔ درخت کو چھتری سے تشبیہ دینے سے مراد ہر شے پر دائرے کا غالب ہونا ہے۔

۴۔ نصف شب کو آسمان و زمین کا فاصلہ کم ہونے کا مطلب ہے کہ شب بیداری سے زمین کا شعور، آسمان کے شعور (لاشعور) سے قریب ہو جاتا ہے۔ حواس کی رفتار تیز ہونے سے فاصلہ محسوس نہیں ہوتا۔

۵۔ مراقبہ ہال سب کے لئے آئینہ ہے۔ اپنے اندر میں واقف ہونے کی خواہش رکھنے والے یہاں کی فضا سے ہم آہنگ ہو کر سکون کی تصویر بن جاتے ہیں۔

۶۔ ''ہر طرف سبز روشنی ہے'' کے الفاظ میں رنگ و روشنی کا قانون ہے۔ سبز رنگ ہے اور روشنی نور کا عکس ہے۔ سبز زندگی اور امید کا رنگ ہے۔ جذبات کو متوازن رکھتا ہے۔

۷۔ اہرام میں شمال رخ روشنی غالب ہے جو ذرّات کو دیر تک ٹوٹنے پھوٹنے سے محفوظ رکھتی ہے۔

۸۔ پلک نہ جھپکنے سے ذہن میں تصویر نہیں بنتی۔ شعوری تحریکات رک جاتی ہیں اور نگاہ لاشعور میں دیکھتی ہے جہاں پر نقش و نگار کی بنیاد کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

۹۔ جب ذہن رنگوں کو تقسیم کئے بغیر دیکھتا ہے تو ڈائی مینشن مغلوب ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ انجیر میں رحم کی تصویر ہے اور زیتون میں کاربن نہیں ہوتا۔ ہر شے میں کائناتی قوانین کا راز ہے۔

۱۱۔ جان جب زیتون کی جان سے ملتی ہے تو یہ واقفیت روشنی کی سطح پر ہے۔ جسم الگ رہتا ہے، روشنیاں یکجا ہوتی ہیں اور فرد اس احساس کو جسم کا ملنا سمجھتا ہے*۔ ظاہری دنیا الوژن ہے۔

۱۲۔ نقطہ، نقطے کے اطراف روشنی کا ہالہ اور روشنی کے ہالے پر نور کا غلاف شعور کے مدارج ہیں۔

۱۳۔ خود کو تلاش کرنے پر نقطے کے علاوہ کچھ نہ دیکھنا نفی کا قانون ہے۔

۱۴۔ تفکر سے دماغ میں کھربوں خلیے چارج ہوتے ہیں۔

۱۵۔ انسان کا کھربوں دائرے میں بند ہونا "نور علیٰ نور" کی تشریح ہے۔

محمد فیض (جدہ): اکتوبر کے "آج کی بات" نے یادوں سے جوڑ دیا۔ تحریر حرف بہ حرف منظر بن گئی۔ میں نے دل کی آنکھ سے مہربان دوست کے آستانے کو جانے والی گلیوں کو دیکھا۔ رشک آیا کہ یہ گلیاں ہر حال میں آستانے سے رشتہ استوار رکھتی ہیں۔ دروازہ کھلا اور میں اندر جا کر خود کو بھول گیا۔ ہر گوشے نے سکون کی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ پُرسکون لہریں میرے اندر داخل ہوئیں اور میں دوست کے سجائے ہوئے چمن کی طرف بڑھا۔ درخت سائبان بن گئے، ٹھنڈی گھاس نے سرخ تلووں کو ٹھنڈک بخشی اور پھولوں کی مہک نے بوجھل وجود لطیف کر دیا۔ یہاں کے دن اور راتیں اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہیں اور آنے جانے والوں کو اشاروں کنایوں میں "حال" سناتی ہیں۔ بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر جانتا ہوں کہ تحریر طویل ہو گئی تو مختصر کر دی جائے گی اور حالِ دل اوراق میں گم ہو جائے گا۔ اتنا کہنا چاہتا ہوں، سچ ہے کہ ــــ "یہاں ایک جان ایسی ہے جو سب کو جانتی ہے اور سب اس کو جانتے ہیں اور اس سے گلے ملتے ہیں۔"

ناصر (کراچی): لکھا ہے " نصف شب کے بعد آسمان اور زمین کا فاصلہ کم ہو جاتا ہے"۔ اس کا مطلب کیا ہے؟

نوشین (وہاڑی): نقطہ اسپیس ظاہر ہونے کے بعد وجود کی پہلی شکل ہے جس کی تکرار سے زندگی آگے بڑھتی ہے۔

صابرہ خاتون (لاہور): ڈائی مینشن ظاہر ہو کر چھپ جاتے ہیں لیکن ان میں موجود جان باقی رہتی ہے۔

شمع سلطان (سکھر): مراقبہ ہال پر سکون کی لہریں غالب ہیں۔ وہاں خود سے ملنے کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔

---

* اس جملے کو تین دفعہ غور سے پڑھئے۔

اکتوبر 2020ء کے مضامین پر قارئین کی آراء اور تبصرے:

گوہر نوید (ٹورنٹو): ربیع الاول کی نسبت سے ”مدحت شانِ رسولؐ“ میں انتخاب بہترین تھا۔ دوستوں کو بھی پڑھایا۔ جگن ناتھ کرتارپوری کا نعتیہ کلام ” بڑی ہی منتوں کے بعد شامِ منتظر آئی “ بے حد پسند آیا۔ ایک دوست نے توجہ دلائی کہ کناروں پر بنی بیلوں میں پھولوں کے درمیان ”ؐ“ لکھا ہے۔ صلوٰۃ و سلام کا کیا خوب نذرانہ ہے۔ حمد میں پھولوں کی لڑی میں ”ؔ“ بنا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اللہ کی شان ” جلَّ جلالہٗ“ کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، آمین۔ سیرت طیبہؐ کے حوالے سے مضامین اچھے تھے۔

شہروز خان (شہر کا نام نہیں لکھا): مضمون ” تبادلۂ خیال“ عمدہ ہے۔ درخت کی گواہی اور حنینِ جذع کے معجزات کو حیات و ممات کے قانون کی روشنی میں دیکھنا تفکر کا منفرد پہلو ہے۔

صائمہ ناصر (قطر): پیراسائیکالوجی سے مسائل کا حل خدمتِ خلق کے ساتھ تربیتی سلسلہ ہے۔ جوابات پڑھ کر نتیجہ سامنے آیا ہے کہ مسائل کی بنیاد غلط رویہ اور منفی سوچ ہے۔ اکتوبر 2020ء کے شمارے میں ایک بچی کا مسئلہ پڑھا جس کی صحیح دل جوئی نہ ہونے سے ذہن متاثر ہو گیا۔ مضمون ”تنہائی کی دیوار“ معاشرے کی تصویر ہے، پڑھ کر مرزا غالبؔ کا مصرعہ زبان پر آ گیا ”کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا۔“

ر۔ج (پشاور): میرا خیال ہے کہ نسل مرغی سے چلی ہے۔ مکالمے میں ایک جگہ بھائی کا جواب پڑھ کر بہت ہنسی آئی جب اس نے ہر دلیل کا جواب ملنے پر بالآخر کہا کہ پہلی مرغی پیدا نہیں، ظاہر ہوئی تھی۔ ”ماہنامہ قلندر شعور“ کے مضامین کے معیار میں اضافہ ہوا ہے۔ قاری ہر بات نئے انداز سے سوچنا سیکھتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ باقاعدگی سے رسالہ پڑھنے سے طرزِ فکر مثبت ہو گئی ہے۔ تجویز ہے کہ کچھ صفحات ”شرح لوح و قلم“ کی تشریح کے لئے مختص کئے جائیں۔

احمد شہزاد (برمنگھم): انڈا مرغی سے پیدا ہوتا ہے اور مرغی انڈے سے بنتی ہے۔ کون پہلے آیا، فیصلہ نہیں کر سکا۔ دیکھتے ہیں کہ دوسرے قارئین کیا جواب دیتے ہیں۔

محمد اسلم (کراچی): اگر مرغی پہلے پیدا ہوئی تو ساتھ مرغا بھی ہوگا کیوں کہ تخلیق دو رخ ملنے سے ہوتی ہے۔

سلمیٰ رضا (دبئی): کُن کے بعد سب ایک ساتھ ظاہر ہوئے اس لئے مرغی اور انڈا دونوں ساتھ آئے ہیں۔

امِ کلثوم (اسلام آباد): بچوں کی کہانیوں میں ہلکے پھلکے انداز میں روحانی فارمولے لکھ دیئے جاتے ہیں۔ میں خود بھی شوق سے پڑھتی ہوں اور بچوں کو بھی پڑھ کر سناتی ہوں۔ جب انہیں کہانی یاد ہو جاتی ہے پھر سمجھاتی ہوں۔ ” ماہنامہ قلندر شعور“ کی طرز پر بچوں کے لئے علیحدہ رسالہ نکالنا چاہئے۔

روشن نظیر (راولپنڈی): عرض یہ ہے کہ "مرشد کی باتیں" سلسلہ دوبارہ کب شروع ہوگا۔ مجھ سمیت بہت سے بہن بھائی، عزیز دوست احباب کتاب "مرشد کی باتیں۔ جلد اول" ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

* **"مرشد کی باتیں" میں کون سی بات ایسی ہے جس نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟**

احمد نواز (اٹک): "ماہنامہ قلندر شعور" کے شمارے میں "آج کی بات" کو روحانی کلاس کا درجہ دینے کی تجویز اچھی ہے۔ گزارش ہے کہ اوپن یونیورسٹی کی طرز پر اسباق ترتیب دیئے جائیں اور وہ لوگ جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتے ہیں اور نزدیکی مراقبہ ہال تک آنا ممکن نہیں ہوتا، انہیں بھی کلاس میں داخلہ دیا جائے۔

صبا گلزار (اسکاٹ لینڈ): "دادی اماں سلام" لمحہ فکریہ ہے کہ ہم بچوں کی کیسی تربیت کر رہے ہیں۔ تجویز ہے کہ "فقیر کی ڈاک" انگریزی زبان میں شائع کی جائے۔

ذہین زبیر (جماعت دوم): سارہ باجی! مجھے آپ کی کہانیاں پسند ہیں۔ کہانیاں پڑھ کر میں حیران ہو جاتا ہوں۔ آپ اتنا اچھا کیسے لکھتی ہیں۔ آپ کو خیال کہاں سے آتا ہے؟

محمد عثمان (کراچی): اکتوبر کے شمارے میں "زیارتِ نبیؐ" اور "پیاری آپا جیؒ" بہترین تحریریں ہیں۔ محترم عظیمی صاحب کی والدہ محترمہ کے بارے میں مضمون پڑھ کر ہمیں اپنی مرحومہ والدہ بہت یاد آئیں۔ وہ بہت شوق سے "روحانی ڈائجسٹ" میں آپا جیؒ کے بارے میں لکھے گئے مضامین پڑھتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنا قرب عطا فرمائے، آمین۔ "آج کی بات" میں مراقبہ ہال کراچی کی جو منظر کشی کی گئی ہے، پڑھ کر دل اس روحانی ماحول کا حصہ بننے کو بے قرار ہے۔ اس کو دوبارہ شائع کر کے آپ نے مجھ سمیت ان لوگوں کو تحفہ دیا ہے جو روحانی علوم سیکھنے کے لئے یہاں آنا چاہتے ہیں اور اپنے اندر (روح) سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

شبانہ کوثر (فیصل آباد): "سمندر شعور کا پھیلاؤ ہے" اکتوبر کے بہترین مضامین میں سے ہے۔ دن، رات، سورج اور چاند کا اپنے فلک میں تیرنے اور پہاڑوں کا بادلوں کی طرح اڑنے میں مماثلت روحانیت اور سائنس کے طالب علموں کے لئے اہمیت کی حامل ہے۔ آخر میں واقعہ لکھا ہے کہ دو افراد بحث کر رہے تھے۔ ایک نے کہا، جھنڈا ہل رہا ہے، دوسرے نے کہا کہ ہوا جھنڈے کو ہلا رہی ہے۔ وہاں سے گزرنے والے روشن ذہن شخص نے کہا کہ جھنڈا ہل رہا ہے نہ ہوا ہلا رہی ہے، یہ ذہن ہے جو حرکت کر رہا ہے۔ پڑھ کر یہ سمجھی ہوں کہ یہاں ہر شے پتلی نما ہے جس کے تار ذہن سے جڑے ہوئے ہیں اور اصل حرکت ذہن میں ہو رہی ہے۔

پروفیسر محمد طاہر (چنیوٹ): اکتوبر 2020ء کا رسالہ ہاتھ میں ہے۔ "آج کی بات" 29 سال پہلے بھی پڑھی، آج بھی پڑھی اور بار بار پڑھی۔ مجھے 29 سال قبل کا وہ وقت یاد آ گیا جب محترم عظیمی صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اس تحریر کو اپنی ہینڈ رائٹنگ میں لکھ کر سمجھو۔

زیر سرپرستی

اللہ کے دوست حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی

عظیمیہ روحانی لائبریری برائے خواتین

روحانی علوم کے متلاشی خواتین و حضرات، راہِ سلوک کے مسافر اور روحانی سائنس میں دلچسپی رکھنے والے طالبات وطلبہ کے لئے عظیمی صاحب کی کتب اور تصوف کی دیگر کتابیں مطالعہ کے لئے موجود ہیں۔

فری ممبرشپ
فری مطالعہ

مکان نمبر 65 بلاک A-2، پنجاب ہاؤسنگ سوسائٹی

نزد جوہر ٹاؤن، لاہور۔ فون نمبر: 042-35185142

حامد ابراہیم

لوہے سے ایجادات کا ظہور

حضرت داؤدؑ روشنیوں کی مخصوص ترکیب (لوہا) میں ایک اور روشنی (سختی) کی جس قدر چاہتے کمی بیشی فرماتے۔ وہ اپنے اندر روشنی کے ذخیرے کو ارادے سے مرتکز کر دیتے تھے۔

اللہ رب العزت فرماتے ہیں،

"اور بے شک ہم نے داؤدؑ کو اپنی طرف سے فضل عطا کیا۔ اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح کرو اور پرندو۔ اور ہم نے اس کے لئے لوہے کو نرم کر دیا کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور کڑیوں کے جوڑنے میں اندازہ رکھو، اور اچھے عمل کرو۔ تم جو کرتے ہو بے شک میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔" (سبا: ۱۰۔۱۱)

آیات میں لوہے یعنی دھات کی طبعی خصوصیات بیان کی گئی ہیں اور ایک طرح سے ان تمام دھاتی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو دھات کاری اور دھات پر مبنی صنعت کی اصل ہیں۔ فارمولا یہ بتایا گیا ہے کہ لوہے یا کسی بھی دھات کو روایتی طریقوں سے ہٹ کر حسبِ منشا شکل میں ڈھالا جاسکتا ہے۔

قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس کی آیات اور الفاظ شے کی خصوصیات کا احاطہ کرتے ہیں اور لامحدود وسعت رکھتے ہیں۔ جیسے الَنّا یعنی ہم نے نرم کر دیا۔ اس لفظ کا مصدر ل ی ن ہے جس کے معنی نرمی کے ہیں۔ ایسی نرمی جو دباؤ، ضرب یا مخصوص طریقے سے لگائی گئی قوت کے نتیجے میں آسانی سے اپنی حالت تبدیل کرلے اور مزاحمت نہ کرے۔ لوہا اور باقی دھاتوں میں مشترک خصوصیت یہ ہے کہ مسلسل گرم کرنے سے ان میں درجہ بدرجہ نرمی آتی ہے حتیٰ کہ ایک خاص درجہ حرارت پر یہ پگھل جاتی ہیں۔ نرم دھاتوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایک ہی مقدار میں دبانے سے یکساں پھیلتی ہیں۔ اس طرح دھات کو کوٹ کر پھیلاتے اور چادریں بناتے ہیں۔

آیت میں ایک لفظ سٰبغٰت ہے جس مصدر س ب غ ہے۔ مطلب کشادہ یا کھلا ہونا ہے یعنی لوہے کو یکساں پھیلا کر پہلے چادر کی صورت دی گئی ہے پھر اس سے کشادہ اور کھلی زرہیں بنائی گئی ہیں تاکہ پہننے والے کی حفاظت ہو اور وہ ان کو پہن کر

آزادانہ حرکت کرے۔ محقق دھاتوں کے پھیلنے کی صلاحیت کو malleability کا نام دیتے ہیں۔

زرہیں کشادہ ہونے کا مطلب لوہے کو خوب پھیلانا یعنی یکساں موٹائی کی چادر بنانا پھر جسم کی بناوٹ کے مطابق ڈیزائن تیار کرنا ہے تاکہ پہن کر تنگی محسوس نہ ہو۔ نرم ہونے کے بعد ہر دھات میں دباؤ جذب کرکے پھیلنے کی گنجائش مختلف ہوتی ہے۔ سونے چاندی میں یہ گنجائش زیادہ ہے۔ خالص سونے کا پانچ ملی میٹر (ایک انچ کا پانچواں حصہ) قطر کا موتی پھیلا کر تقریباً ساڑھے پانچ مربع فٹ کے ورق میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ایسا ایک ورق جاپان کے "توئی" عجائب گھر میں موجود ہے۔ چاندی کے پھیلنے کی صلاحیت بھی سونے جیسی ہے۔ پلاٹینم، پیلاڈیئم، تانبا اور المونیم دھاتوں کے بھی ورق بنائے جاسکتے ہیں۔

ورق انتہائی پتلی تہ ہے جب کہ چادر نسبتاً موٹی تہ ہے۔ بعض دھاتوں میں دباؤ کے تحت پھیلنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ لوہا پھیلاتے وقت خصوصاً زرہ بناتے ہوئے یہ تعین کرنا ضروری ہے کہ لوہے کی چادر کی موٹائی کم از کم اتنی ہو کہ ہتھیار کا وار برداشت کرسکے۔ لوہے کی سختی اور مضبوطی قائم رکھنے اور ممکنہ حد تک سب سے پتلی تہ یا چادر بنانے میں نسبت قائم کرنے کی مقداریں معین ہیں۔

حضرت داؤدؑ زرہ کے لئے خام یا کسی دوسری شکل کے لوہے کو نرم کرکے پھیلاتے تھے حتیٰ کہ وہ یکساں موٹائی کی چادر میں تبدیل ہوجاتا۔ پھر مضبوطی کے لئے ضرورت کے تحت موٹائی قائم رکھتے ہوئے اسے شانوں، سینے اور پیٹ کی بناوٹ کے مطابق موڑ دیتے۔ سر اور منہ کی حفاظت کے لئے ہیلمٹ (خوَد) بناتے، بازو اور پیروں کی حفاظت کے لئے زرہ کی ساخت ان اعضا کے مطابق ہوتی تھی۔

حضرت داؤدؑ کے زمانے میں پورے جسم پر زرہ پہننے کا طریقہ رائج تھا کیوں کہ معرکہ طالوت و جالوت میں بیان کیا گیا ہے کہ ظالم جالوت جو دیو قامت اور قوی ہیکل تھا، سر تا پا زرہ میں ملبوس میدانِ جنگ میں اترا۔ حضرت داؤدؑ نے فلاخن* کے پہلے وار سے اسے ہلاک کر دیا۔

دھاتوں کو حرارت کے ذریعے نرم کرکے، کوٹ کر یا پگھلا کر دوبارہ پتلی تہوں میں جمانے سے دھاتوں کی چادریں بنائی جاتی ہیں جن سے گاڑیوں اور مشینوں کے اہم پرزے اور آلات بنتے ہیں۔ ریل گاڑیوں، ہوائی جہازوں، مال بردار اور مسافر بردار بحری جہازوں، میزائلوں اور جنگی طیاروں کے علاوہ توپ خانے کی مشینوں کے بیرونی حصے اور

* فلاخن (غلیل نما ہتھیار)

ساخت اسی دھاتی خاصیت کے مرہون منت ہیں۔ وہ ممالک جو گاڑیوں، ہوائی جہازوں اور جنگی جہازوں کی صنعت میں آگے ہیں، دھات کی اس خصوصیت کے علم کے بغیر یہ ایجادات نہیں کرسکتے۔ چناں چہ قرآن کریم میں دھاتوں کا موم کی طرح پھیل کرتہ، چادر یا ورق کی صورت اختیار کرنا اور حسبِ منشا کسی بھی شکل میں ڈھالنے کی خاصیت کا تفصیلی بیان ہے اور لفظ سٰبغٰت اس کا احاطہ کرتا ہے۔

قارئین کرام! دھاتوں کی دوسری اہم ترین خصوصیت ان کا حرارت کے تحت نرم ہونے کے بعد مسلسل کھینچنے پر تاروں کی شکل اختیار کرنا ہے۔ نرم دھات کھینچ کر موٹی پتلی سلاخوں اور تاروں (جو بال سے باریک ہوسکتی ہیں) میں تبدیل ہونے کی خصوصیت کو دھات کاری یا سائنسی زبان میں ductility (لچک) کہتے ہیں۔ دھاتیں پھیلنے کی خاصیت رکھنے کی وجہ سے ایک طرف شے کا خول، خدوخال یا جسم بناتی ہیں تو دوسری طرف ان کو کھینچنے اور لمبا کرنے سے سلاخیں اور تاریں بنتی ہیں جو ہر قسم کے کَل پرزے اور شے کا ڈھانچا بنانے کی بنیاد ہے۔ اس طرح دھات میں پھیلاؤ اور لچک، دھات کی صنعت کی بنیاد ہے۔

مذکورہ آیات میں ایک لفظ السرد ہے۔ عربی لغت کے مطابق یہ لفظ ایسی زرہ کی وضاحت کرتا ہے جس میں لوہے کی چھوٹی کڑیوں پر مشتمل زنجیروں کو دھاگوں کی طرح جوڑا جاتا ہے۔ اس زرہ میں کپڑے کی سی لچک ہوتی ہے اور جنگجو لباس کی طرح پہن سکتے ہیں۔ عجائب گھروں میں دھاتی چادر اور دھاتی زنجیروں پر مشتمل دونوں قسم کی زرہیں موجود ہیں۔

آج ہر قسم کے پیچ، کیل، نٹ بولٹ، سلاخیں، گاڑیوں کے پہیّوں کے دھرے (axel)، تعمیراتی سریے، مشینوں، گاڑیوں، جہازوں، توپ خانوں وغیرہ کے پرزے دھات میں موجود صلاحیت لچک کی مرہون منت ہیں۔

علیم و حکیم ہستی اللہ کا فرمان ہے:

"اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لئے آسان کر دیا، پس کوئی ہے جو اسے سمجھے؟" (القمر:۱۷)

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو دھات کی صفات کا علم عطا فرمایا جن سے وہ حسبِ ضرورت اشیا بنا لیتے تھے۔ اس میں جو امر عجیب و غریب ہے، وہ یہ کہ حضرت داؤدؑ روایتی طریقوں یعنی بھٹی میں آگ دہکا کر شدید گرم کرکے، ہتھوڑوں کی ضربیں لگا کر اور دھات کاری کے مروجہ طریقے کام میں لانے کے بجائے دھات کو ہاتھوں میں پگھلاتے تھے۔ لوہا ان کے ہاتھوں میں، جتنا وہ چاہتے، نرم ہو جاتا۔ وہ

اسے پھیلا کر پتلا کر لیتے یا کھینچ کر تار بنا دیتے۔

سوال یہ ہے کہ یہ کون سا علم ہے؟ قرآن کریم میں بیان کئے گئے اس علم کی وضاحت پیش کرنے سے تحقیق و تلاش (سائنس) قاصر ہے۔

لوہے کے پگھلنے کا درجہ٫ حرارت 1538 ڈگری سینٹی گریڈ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ اس سے کچھ درجے پہلے لوہے میں موم کی طرح اتنی نرمی ہوتی ہے کہ مطلوب قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ موم کی مثال نرمی کے لئے دی جاتی ہے ورنہ لوہا نرم حالت میں موم سے زیادہ لچک دار اور مضبوط ہے۔ محققین نے نرم حالت میں لوہے کی لچک کو پلاسٹک سے کئی درجے زیادہ قرار دیا ہے۔

ا۔ پانی 100 ڈگری سینٹی گریڈ پر ابلتا ہے۔

۲۔ ہر قسم کا گوشت اوسط 63 ڈگری سینٹی گریڈ تک کھانے کے لئے گل جاتا ہے۔

۳۔ انسانی جسم کا اوسط درجہ٫ حرارت 37 درجے تک ہوتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ماحول کا درجہ٫ حرارت 25 درجے سے بڑھ جائے تو آدمی کو گرمی محسوس ہوتی ہے۔ 35 سے بڑھے تو پسینہ نکلتا ہے اور 40 سے زیادہ ہونے پر موسم ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ 60 درجے تک جسم کا اپنا درجہ٫ حرارت برقرار رکھنے کا نظام بے کار ہو جاتا ہے یعنی زائد حرارت سے موت واقع ہو سکتی ہے۔ حرارت کا درجہ اس سے زیادہ ہونے پر تھرمامیٹر یا دوسرے آلے سے معلوم کرتے ہیں، ہاتھ لگا کر تجربہ نہیں کر سکتے۔ پھر 1500 ڈگری سینٹی گریڈ یا اوپر کے درجہ٫ حرارت پر لوہے کو براہِ راست ہاتھ میں پکڑ کر موڑنا یا کوئی شکل دینا کیسے ممکن ہوا؟

لوہا دہکنے پر بھورے سرخ سے گہرے سرخ، گہرے سرخ سے شوخ سرخ، شوخ سے نارنجی، نارنجی سے سبزی مائل زرد اور پھر زرد، زرد سے دودھیا سفید پھر سفید، 1300 درجے تک پہنچنے پر روشن سفید اور 1538 درجے یعنی پگھلنے کے بعد ہلکی نیلاہٹ لئے مزید روشن سفید ہو جاتا ہے۔ نامیاتی مادے مثلاً لکڑی اور گوشت وغیرہ اس درجہ٫ حرارت پر راکھ ہو جاتے ہیں مگر حضرت داؤدؑ کا ہاتھ سلامت رہا۔ لوہا ہاتھ میں پگھلانے میں کون سا فارمولا استعمال ہوا؟

تفکر سے درج ذیل نکات واضح ہوتے ہیں:

ا۔ لوہا نرم ہونے کے لئے جو توانائی درکار ہے وہ حضرت داؤدؑ کے ہاتھوں میں یکجا ہو جاتی۔

۲۔ توانائی منتقل کرتے ہوئے کمی بیشی کرنا۔ یعنی جہاں سے لوہے کو موڑنا، پھیلانا یا کھینچنا مقصود ہوتا، حسبِ ضرورت توانائی منتقل کر دیتے۔

۳۔ اس دوران ہاتھ توانائی سے متاثر ہوتے نہ درجہ٫ حرارت کے اثرات مشکل پیدا کرتے۔

۴۔ دھات پگھلانے اور مختلف چیزیں بنانے کے لئے جو علم استعمال کیا گیا، وہ مقداروں پر قائم ہے۔

۵۔ درجہ،حرارت ، توانائی، اشیامیں نرمی اور سختی کے جو احساسات عام طور پر مادی جسم سے وابستہ ہیں،وہ مفروضہ ہیں۔ مفروضہ حواس کے مطابق جسم گوشت پوست سے بنا ہے اور اسے زندہ رہنے کے لئے خاص درجہ،حرارت، نمی اور ہوا کا مخصوص تناسب اور دباؤ درکار ہے۔ جب کہ حضرت داؤدؑ نے ہاتھوں کے ذریعے لوہے کو موم کی مانند نرم کردیا اور آگ پانی وغیرہ استعمال کئے بغیر لوہے سے اعلیٰ معیار کی زرہیں اور دوسری اشیا بنائیں۔ وضاحت ہوتی ہے کہ ابنِ آدم کے اندر ایسی قوت موجود ہے جو اپنی توانائی مادی جسم میں منتقل کرکے اس کی صلاحیتوں میں حیرت انگیز اضافہ کرسکتی ہے۔ قرآن کریم اور الہامی کتابوں نے اس قوت کو روح کے نام سے متعارف کروایا ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا نور ہیں۔ کائنات میں ہر شے نور اور روشنی کی مخصوص ترکیب ہے۔ اس طرح لوہا بظاہر سخت مادہ ، جامد، کثیف اور ٹھوس ہے لیکن اس کی اصل نور یا روشنی ہے۔ روشنی میں مزید کتنی اور کون سی روشنیاں شامل کی جائیں کہ لوہے کی روشنی کی ترکیب متاثر نہ ہو مگر اس میں سختی کی مقدار اتنی کم ہو جائے کہ مرضی کے مطابق شکل دی جاسکے۔ حضرت داؤدؑ کو لوہے کی مقداروں اور ان میں تصرف کا علم تھا۔

احسن الخالقین اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اور ہم نے لوہا نازل کیا اس میں شدید سختی ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں۔“ (الحدید: ۲۵)

آیت میں لوہا نرم کرنے کا فارمولا ہے۔ لوہا نازل کیا یعنی مقداروں کا خاص مجموعہ ایک شکل میں نازل ہوگیا۔ ان مقداروں کے ساتھ ایک مخصوص مقدار کا الگ سے ذکر کرنے میں حکمت ہے۔ سختی کی مقدار لوہے کی مقداروں کے ساتھ الگ بیان کی گئی ہے ،اس میں کمی بیشی لوہے کو حسبِ ضرورت نرم اور سخت بناتی ہے۔

حضرت داؤدؑ روشنیوں کی مخصوص ترکیب (لوہا) میں ایک اور روشنی (سختی) کی جس قدر چاہتے کمی بیشی فرماتے۔ وہ اپنے اندر روشنی کے ذخیرے کو ارادے سے مرتکز کردیتے تھے۔ اس طرح قرآن نے لوہے کی مقداروں میں موجود سختی کی مقدار میں کمی بیشی کرنے اور اس سے ایجادات کرنے کے علوم کے ساتھ روشنی کے ارتکاز کا علم بھی بیان فرمایا ہے۔ آج کی سائنس نے روشنیوں کے ارتکاز کو ”لیزر“ کا نام دیا ہے۔

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں:

”حضرت داؤدؑ کے قصے میں لوہے کی ایجادات کا ظہور اور لیزر شعاعوں کے فارمولے کا ذکر ہے۔“

(کتاب: خاتم النبیین محمد رسول اللہؐ۔ جلد سوم)

روشنی میں وجود

کائنات علم ہے جس کا وقوف خالقِ کائنات اللہ نے مخلوق کو عطا کیا ہے۔ اللہ کی ایک تخلیق لوہا ہے۔ جن لوگوں نے لوہے (دھات) کی حیثیت اور طاقت کو تسلیم کر کے گہرائی میں تفکر کیا، لوہے کی لامحدود صلاحیتیں سامنے آگئیں۔ جب ان صلاحیتوں کو استعمال کر کے لوہے کے اجزائے ترکیبی کو متحرک کر دیا تو لوہا ایسی عظیم شے بن کر سامنے آیا جس سے موجودہ سائنس کی ہر ترقی کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے۔ یہ وسائل میں تصرف ہے یعنی اُن وسائل میں جن کا ظاہر وجود ہمارے سامنے ہے۔

لوہے کی طرح روشنی بھی وجود ہے۔ وسائل کی حدود سے گزر کر یا وسائل کے علوم سے آگے بڑھ کر جب کوئی بندہ روشنیوں کا علم حاصل کر لیتا ہے تو بہت سی ایجادات کر سکتا ہے۔ وسائل میں محدود رہ کر ہم سونے کے ذرّات کو اکٹھا کر کے خاص process (مراحل) سے گزار کر سونا بناتے ہیں۔ لوہے کے ذرّات اکٹھا کر کے خاص پروسیس سے گزار کر ہم لوہا بناتے ہیں۔ وہ بندہ جسے اللہ نے روشنیوں میں تصرف کا اختیار عطا کیا ہے، اس کے لئے سونے کے ذرّات کو مخصوص پروسیس سے گزارنا ضروری نہیں۔ وہ اپنے ذہن میں روشنیوں کا ذخیرہ کر کے ان مقداروں کو الگ کر لیتا ہے جو سونے اور لوہے کے اندر کام کرتی ہیں اور ان مقداروں کو ایک نقطہ پر مرکوز کر کے سونا اور لوہا بنا دیتا ہے۔

ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ نے کتاب "لوح و قلم" میں سونے اور لوہے کی مقداریں بیان کی ہیں۔

سونا = حس زرد رنگ + سخت + چکنا + چمک + بساطت

لوہا (فولاد) = حس سیاہ رنگ + سخت + بھاری وزنی + کھردرا + چپک + کسیلا + پگھلنا + موٹا

علم سے واقف ہونے کا راستہ تفکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا سب تمہارے لئے مسخر کر دیا"۔ جو تفکر کرتا ہے، اللہ کے حکم کے مطابق کائنات اس کے لئے مسخر ہو جاتی ہے۔

عابد محمود

کراچی ماں جیسا شہر ہے

ایک مہینے میں ناظم آباد، ناگن، صدر، کلفٹن، طارق روڈ اور کئی علاقے دیکھ لئے لیکن کراچی نہیں ملا۔ آج بھی تھک ہار کر فٹ پاتھ پر لیٹ گیا۔

سورج کی کرنیں سڑک کنارے بیٹھے بھولے پر پڑیں تو آنکھ کھل گئی۔ نیم پاگل بھولے نے بازو پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ یقین ہوگیا کہ وہ کھویا نہیں —— وہی بھولا جاگا ہے جو سونے لیٹا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اس لئے سیاہ پٹی کی مدد سے خود کو پہچانتا تھا۔

راہ گیروں کے دیئے ہوئے سکّے اور دس دس کے نوٹ گنے بغیر جیب میں ڈالے پھر سڑک پر رواں دواں ٹریفک کو دیکھا، اٹھ کر آنکھیں ملتے ہوئے سڑک پار کی۔ چائے والے سے چائے کا کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چائے والے نے بھولے کا حلیہ دیکھ کر کچھ کہے بغیر چائے دے دی۔

بھولے نے توجہ گزرتی ہوئی گاڑیوں پر مرکوز کر کے چسکیاں لیتے ہوئے چائے پی اور ساتھ والی میز پر سے کسی کا چھوڑا ہوا پراٹھا اٹھالیا۔ ناشتا کر کے وہاں سے اٹھا۔ فاصلے پر پرانی طرز کی بڑی عمارت تھی جس کے باہر گاڑیوں اور لوگوں کا ہجوم تھا، وہ ہجوم میں شامل ہوگیا۔

یہ ریلوے اسٹیشن تھا۔ لوگوں کو ریل گاڑی میں سوار ہوتا دیکھ کر وہ بھی ایک ڈبے میں سوار ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد سیٹی بجی اور ریل گاڑی آہستہ آہستہ پٹری پر سرکنے لگی۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے مسافر سے پوچھا، سب کہاں جارہے ہیں؟

مسافر نے مختصر جواب دیا، کراچی۔

کراچی کیا ہے؟

مسافر سمجھ گیا کہ یہ پاگل ہے اور سوچے سمجھے بغیر گاڑی میں سوار ہوگیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اپنے شہر کی یادیں جھلملانے لگیں۔ بتایا کہ کراچی ماں جیسا شہر ہے جو ہر آنے والے کو جگہ دے کر روزگار دیتا ہے۔ بھولا فرطِ شوق سے بولا، مجھے بھی کراچی دیکھنا ہے۔ مجھے بھی کراچی جانا ہے۔

گاڑی کراچی ہی جارہی ہے۔ مسافر نے بتایا۔

نیم پاگل بھولے نے گردن ہلاتے ہوئے مجھے کراچی دیکھنا ہے، مجھے کراچی دیکھنا ہے، مجھے کراچی

دیکھنا ہے، کی تکرار شروع کر دی۔

ریل گاڑی کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوئی اور کراچی کے پلیٹ فارم پر رک گئی۔ پلیٹ فارم پر بھیڑ تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا مسافر سامان اٹھا کر گاڑی سے اترا۔ بھولے نے دیکھا کہ سارے مسافر اتر رہے ہیں۔ کافی دیر انتظار کے بعد وہ بھی باہر آ گیا۔ پلیٹ فارم کے خارجی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قلی سے پوچھا، بھائی صاحب! یہ کون سی جگہ ہے؟

یہ کینٹ اسٹیشن ہے۔ قلی جواب دے کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

مگر مجھے تو کراچی جانا تھا۔ یہ کینٹ اسٹیشن ہے۔ لگتا ہے گاڑی غلط جگہ لے آئی ہے۔

دوبارہ پلیٹ فارم کی طرف بھاگا اور ریل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ صفائی والوں نے زبردستی باہر نکالنا چاہا تو اس نے شور مچا دیا کہ مجھے کراچی جانا ہے۔

تم کراچی میں ہو۔ یہ کراچی ہے۔

نہیں یہ کراچی نہیں ہے، مجھے کراچی جانا ہے، مجھے کراچی جانا ہے۔

وہ سمجھ گئے کہ پاگل ہے۔ جان چھڑانے کے لئے کہا، اسٹیشن کے گیٹ سے باہر نکلو گے تو کراچی پہنچ جاؤ گے۔ اور بہلا کر ڈبے سے اترنے پر آمادہ کیا۔ بھولا اسٹیشن سے باہر آیا اور گھومتا پھرتا آئی آئی چندریگر روڈ پہنچا۔ چائے کے ہوٹل کے باہر رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

بیرے کو آواز دی، چائے پینی ہے۔

ہوٹل والے حلیہ دیکھ کر سمجھ گئے کہ پاگل ہے۔ چائے کا کپ اس کے آگے رکھ دیا۔ چائے پیتے ہوئے آس پاس دیکھ کر بولا، کراچی میں بہت رش ہے اور گرمی زیادہ پڑتی ہے۔

بیرے نے میز صاف کرتے ہوئے بتایا، آئی آئی چندریگر معروف تجارتی شاہراہ ہے۔ یہاں پر سارا دن اسی طرح رش ہوتا ہے۔

جواب سن کر بھولا چونک گیا۔ صفائی والوں نے غلط بیانی کی ہے۔ میں کراچی میں نہیں، آئی آئی چندریگر روڈ پر ہوں۔

ایک مہینے میں ناظم آباد، ناگن، صدر، کلفٹن، طارق روڈ اور کئی علاقے دیکھ لئے لیکن کراچی نہیں ملا۔ آج بھی تھک ہار کر فٹ پاتھ پر لیٹ گیا۔ نہ جانے کب نیند آ گئی۔ بھولے کو ہمیشہ کھونے کا ڈر رہتا تھا۔ ایک مہینہ گھوم پھر کر جب کراچی نہیں ملا تو یقین ہو گیا کہ وہ کھو گیا ہے۔

کوئی راہ گیر تکان دور کرنے کے لئے فٹ پاتھ پر بیٹھا تو تھوڑی دیر بعد کسی کی نگاہیں محسوس ہوئیں۔

دائیں جانب ایک پاگل پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ حیرت سے چہرے کو دیکھتا اور کبھی اپنے اور اس کے بازو پر بندھی ہوئی سیاہ پٹی کو۔ بھولا پریشان ہو گیا کہ سیاہ پٹی والا تو میں ہوں۔ پھر یہ کون ہے جو سامنے بیٹھا ہے۔

پوچھا، تم کون ہو اور میں کون ہوں؟ اگر تم میں ہوں تو میں کون ہوں۔ کیا ہم دونوں ایک ہیں؟ ایک ہیں تو پھر دو کیوں ہیں؟

راہ گیر بھی انجانی حقیقت کی تلاش میں تھا۔ پاگل کی زبان سے ایسی باتیں سن کر چونک گیا اور پوچھا، تم جس کو میں کہتے ہو، وہ کون ہے؟

وہ میں ہوں۔ سیاہ پٹی والا! بھولے کے لہجے میں یقین تھا۔ راہ گیر نے کہا، جب یہ تم ہو پھر اپنے بارے میں مشکوک کیوں ہو؟

کیوں کہ سیاہ پٹی تمہارے بازو پر بھی ہے۔

تمہاری پہچان سیاہ پٹی ہے؟ راہ گیر نے پوچھا۔

بھولے نے سر ہلایا۔

راہ گیر نے بھولے کے ہاتھ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا، یہ کیا ہے؟

نہ سمجھنے والے انداز میں بتایا، میرا ہاتھ ہے۔

اس نے مسکرا کر لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، اور یہ کیا ہے؟ جواب دیا، لباس ہے۔

اور یہ کیا ہے؟ یہ میرا سر ہے۔

اور یہ کیا ہے؟ میرے کان ہیں۔

پھر اس نے آنکھ، ناک، بال اور آخر میں پیروں کے بارے میں پوچھا تو بھولا الجھے ہوئے لہجے میں بولا، یہ میرے پیر ہیں۔

راہ گیر نے کہا، ان سب میں تم کہاں ہو۔ تم نے ایک مرتبہ نہیں کہا کہ یہ میں ہوں۔ کہتے ہو کہ یہ بازو ہے، یہ ہاتھ ہے، یہ ناک ہے، یہ پیر ہیں۔ اور یہ سچ ہے مگر یہ سب جس کے ہیں، وہ کہاں ہے؟

بھولا حیرت سے اپنے جسم کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ میں تو وہ ہوں جس کے بازو پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی ہے تاکہ خود کو پہچان سکوں۔

ہکلاتے ہوئے راہ گیر کو بتایا، میں وہ ہوں جس کے بازو پر سیاہ پٹی بندھی ہوئی ہے۔

راہ گیر نے کہا، وہ تو میرے بازو پر بھی ہے۔ سیاہ رنگ میں، میں اور تم ایک ہیں۔ اس سے ہٹ کر رنگوں میں ہم الگ الگ ہیں۔

سیاہ رنگ میں ہم ایک ہیں تو میری شناخت ختم ہو گئی۔ باقی رہ جانے والے رنگوں میں خود کو کیسے پہچانوں؟ بھولے کی حیرت عروج پر تھی۔

راہ گیر نے کہا، پہچان کے لئے سب کے چہروں پر رنگ دار پٹی ہے جو بتادیتی ہے کہ یہ فلاں شخص اور فلاں کا بیٹا ہے۔ سر اتار دیا جائے تو شناخت ختم ہو جاتی ہے کہ یہ کس کا جسم ہے۔ ہم سارے لوگ

الگ لیکن ایک ہیں۔ پرندوں، پودوں، جانوروں، پہاڑوں، جنات اور فرشتوں کی دنیا کا کوئی فرد جس رنگ میں ہمارے سامنے آجائے، ہم بتادیں گے کہ یہ کون ہے۔ کیوں کہ سب الگ الگ اور سب ایک ہیں۔ جب ہم اپنا تذکرہ کرتے ہیں تو رنگوں سے مدد لیتے ہیں اور الگ ہو جاتے ہیں۔

بھولے نے کہا، لوگ مجھے نیم پاگل سمجھتے ہیں۔

وہ یہ نہیں دیکھتے کہ تم نیم دانش مند بھی ہو۔

بھولا افسردگی سے بولا، سارے علاقے گھوم لئے اب تک کراچی نہیں ملا۔ میں خود سے بھی واقف نہیں اس لئے پہچان کے لئے سیاہ پٹی باندھی ہے۔

راہ گیر بولا، تم نے رنگوں پر ایک اور رنگ چڑھا لیا۔ جو رنگ پہنے ہیں، انہیں تو اتارو۔

پوچھا، رنگ کیسے اترتے ہیں؟

راہ گیر نے کہا، جب ہم حقیقت کو ٹکڑوں میں تلاش کرتے ہیں تو ٹکڑے ہماری پہچان بن جاتے ہیں۔ کراچی میں ہو مگر تمہیں کراچی نہیں مل رہا۔ اس شہر کو علاقوں میں تلاش کروگے تو کبھی نہیں ملے گا۔ اپنے آپ کو الگ الگ عضو یا مادی جسم میں تلاش کروگے تو تم خود تک ہرگز نہیں پہنچ سکوگے۔ ہر علاقے کو کراچی ـــــ ہر عضو کو اپنا آپ سمجھو۔ کثرت میں دیکھوگے تو کھو جاؤگے۔ وحدت میں دیکھنے سے کائنات اور اپنی رگِ جان کو پالوگے۔

خود کو پہچانو

باپ نے تجوری میں سے گھڑی نکال کر بیٹے کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ تین سو سال پرانی ہے اور کئی نسلوں سے گزر کر مجھے ملی ہے۔ اس سے پہلے کہ تمہیں دوں، سنار کے پاس جا کر قیمت معلوم کرو۔

بیٹا واپس آیا اور بتایا کہ سنار کہتا ہے بہت پرانی ہے، 15 ہزار میں خرید لے گا۔ باپ نے کہا، گروی رکھنے والوں کے پاس جاؤ۔ واپس آکر بتایا، ابا! دو ہزار قیمت لگی ہے۔ کہتے ہیں زیادہ استعمال ہوئی ہے۔

بیٹے نے پوچھا، ابا! آپ اس کی کیا قیمت چاہتے ہیں؟

باپ نے اس بات کا جواب نہیں دیا اور بولا، عجائب گھر والے صحیح قیمت بتائیں گے۔ انہیں دکھاؤ۔

باپ کی تسلی کے لئے بیٹا عجائب گھر گیا۔ بتایا گیا کہ گھڑی کی قیمت کروڑوں میں ہے کیوں کہ یہ نوادرات میں سے ہے، ہم اسے عجائب گھر میں رکھنا چاہتے ہیں۔

بیٹا دوڑتا ہوا آیا اور صورت حال بتائی۔

باپ کے چہرے پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔

بیٹا! مجھے گھڑی فروخت نہیں کرنی۔ بتانا یہ تھا کہ تم کتنے نایاب کیوں نہ ہو، ہر کوئی قدر نہیں کرے گا۔ تمہاری قدر صرف صحیح جگہ پر ہوگی۔ اس لئے کوئی ناقدری کرے تو دل پر مت لینا۔ جب گھڑی کی قیمت کم لگی، تم نے سوچا کہ ابا اسے اہمیت کیوں دے رہے ہیں، اور بات کروڑوں تک گئی تو دوڑتے ہوئے آئے۔ قیمت پہلے بتا دیتا تو عجائب گھر والوں کی بات پر خوش ہوتے نہ سنار کی بات پر دل چھوٹا کرتے۔ پہلے اپنی قدر پہچانو۔ پھر کوئی قدر نہ کرے، خاموشی سے وہ جگہ چھوڑ دو، تمہاری خود اعتمادی قائم رہے گی۔

ہر خوشی اک وقفۂ تیاریِ سامانِ غم
ہر سکوں مہلت برائے امتحان و اضطراب

اضطراب بھائی نے میرے سامنے ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ دیکھو مجھے کتنا بخار ہے۔ نبض پر انگلیاں رکھیں تو میرے اندازے کے مطابق ایک سو تین یا ایک سو چار بخار تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں ڈرائیور کے ساتھ صبح سے سڑکوں پر پھر رہا ہوں، گھر جا کر چارپائی پر اس لئے نہیں لیٹتا کہ بیٹا "اولڈ ہوم" میں چھوڑ آئے گا۔

دنیا کے نقشے کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ دنیا گول ہے۔ لاشعوری بیلٹ پر چلنے والے لوگ کہتے ہیں کہ دنیا پپیتے کی شکل کی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ دنیا محوری اور طولانی گردش میں چل رہی ہے۔

ہر زمانے میں زمین پر دو قسم کے لوگ موجود رہے۔ ایک دنیا میں جی لگانے کو مقصد حیات سمجھتے ہیں، دوسری قسم کے لوگ ہر چیز سے استفادہ کرتے ہیں لیکن دنیا میں دل نہیں لگاتے۔ وہ کہتے ہیں — چوں کہ دنیا کی ہر چیز فانی ہے، فانی چیز میں دل لگانا خلافِ عقل و شعور ہے۔

زمین پر بسنے والے سارے انسان پُرسکون زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ سکون کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ انسان خوش رہے، شک اور وسوسوں سے آزاد رہ کر زندگی گزارے۔ جو فرد خوش نہیں ہے، وہ خوشی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

ہر آدمی کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کا کوئی دوست ہو۔ دوست ایک ہوتا ہے اور کئی دوست بھی ہو سکتے ہیں۔ بڑے لوگ کہتے ہیں آدمی سماجی حیوان ہے۔ یعنی آدمی جانور تو ہے لیکن سماجی (سوشل) ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی آدمیوں کے ساتھ میل جول رکھے، جذبات و احساسات میں دوسروں کے جذبات و احساسات شامل کرے، خوشی غم میں شریک ہو۔ دوستی کی پرکھ یہ ہے کہ دوست دوست کے کام آئے اور دوست کے اچھے برے معاملات کو دوست کے ساتھ مل کر سلجھائے۔

مضمون میں دو کرداروں کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ایک کا نام قناعت اور دوسرے کا اضطراب ہے۔ دونوں ایک دن، ایک ساعت، چند سیکنڈ کے وقفے سے پیدا ہوئے۔ دونوں نے ماں کا دودھ پیا، ماں کی گود میں ہنستے کھیلتے، کلکاریاں بھریں۔ دونوں گھروں میں عزیز رشتہ دار موجود تھے۔

گھر میں صحن، برآمدہ، کمرے اور باورچی خانہ تھا۔ دونوں نے وہی کھانا کھایا جو سب کھاتے ہیں، وہی پانی پیا جو سب پیتے ہیں۔ اس کے باوجود مزاج اور طبیعت میں فرق تھا۔ ایک گھر میں آسائش و آرام کی ہر چیز مہیا تھی اور دوسرے گھر میں ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے چیزیں کم تھیں۔ ایک گھر بڑا اور دوسرا چھوٹا تھا۔ چھوٹے گھر میں صفائی زیادہ تھی، درخت، پھول اور پودے تھے۔ چوں کہ ایک محلے میں رہتے تھے اس لئے ایک ہی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ پڑھ لکھ کر معاش میں مصروف ہوگئے۔

جیسا کہ زمانے میں ہوتا ہے، ایک کی آمدنی بہت تھی اور دوسرے کی آمدنی کم۔ شادی ہوئی اور اللہ نے اولاد سے نوازا۔ ایک کا مزاج خالصتاً دنیا میں تھا اور دوسرے کے مزاج میں قناعت تھی۔ دونوں نے اپنے نقطۂ نظر سے دنیا کو دیکھا اور استفادہ کیا۔

جس کردار کا نام اضطراب ہے، اس نے زندگی گزارنے کے لئے محل تیار کیا۔ محل میں تصوراتی طور پر منقش دیواروں سے کمرے بنائے، ہر چیز اعلیٰ درجے کی پسند کی اور اپنے رتبے کا تعین کیا۔ شب و روز محنت سے یہ چیزیں حاصل کرلیں لیکن اضطراب میں اضافہ ہوگیا۔

سب سے پہلے غم ہوا کہ اگر میرے پاس دولت نہ رہے تو معاشرے میں عزت ختم ہو جائے گی۔ خوف لاحق ہوا کہ لوگ مجھے اغوا کرکے تاوان کا مطالبہ کریں گے۔ دنیا میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے معیار زندگی بڑھانے کو اہمیت دی۔ بینکوں سے قرض لیا، دوستوں کے ساتھ ہیر پھیر کیا اور کروڑوں کے مایا جال میں گرفتار ہوگیا۔

بندہ جب مایا جال میں گرفتار ہوتا ہے تو جذباتی، شعوری اور محسوساتی طور پر محدود ہو جاتا ہے اور محدودیت اپنوں سے بیگانہ کر دیتی ہے۔

اضطراب بھائی کے ذہن میں شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ بیوی کروڑوں کی جائیداد پر قبضہ کرلے گی اور مجھے زہر دے کر مار دے گی۔ بیوی کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ہر شے میں اسے موت نظر آنے لگی، خوف سے نیند اڑ گئی۔ نیند کی کمی سے معدہ خراب ہوا، معدہ خراب ہونے سے بلڈ پریشر بڑھ گیا اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

دوسری افتاد یہ پڑی کہ بیٹے نے دیکھا کہ باپ ماں پر شک کرتا ہے اور دشمن سمجھتا ہے تو باپ سے نفرت ہوگئی۔ بیٹا اضطرابی ذہن کی پیداوار تھا، اس نے باپ کو ایسی حالت سے دوچار کر دیا کہ باپ کے لئے دن کا چین اور رات کا آرام مفقود ہوگیا۔

اضطراب بھائی سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا، بہت پریشان ہوں۔ بیٹے نے ایک کروڑ روپیہ غبن کرلیا ہے۔ میں نے بہت پیار سے سمجھایا

کہ آپ کے بعد سب کچھ بیٹے کا ہے۔ اس نے بینک بیلنس میں سے ایک کروڑ روپیہ لے لیا ہے، کوئی بری بات نہیں کی۔

اضطراب بھائی تقریباً روتے اور سسکتے ہوئے بولے، اب وہ مجھ سے پورے سرمائے کا مطالبہ کرتا ہے۔ کہتا ہے، ابا! ایک دفعہ تو چارپائی پر بیمار ہو کر لیٹ جا، میں تجھے "اولڈ ہوم" چھوڑ آؤں گا۔

یہ کہہ کر اضطراب بھائی نے میرے سامنے ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ دیکھو مجھے کتنا بخار ہے۔ نبض پر انگلیاں رکھیں تو میرے اندازے کے مطابق ایک سو تین یا ایک سو چار بخار تھا۔

انہوں نے کہا کہ میں ڈرائیور کے ساتھ صبح سے سڑکوں پر پھر رہا ہوں، گھر جا کر چارپائی پر اس لئے نہیں لیٹتا کہ بیٹا "اولڈ ہوم" میں چھوڑ آئے گا۔

دوسرے کردار قناعت بھائی کا حال احوال یہ ہے کہ انہوں نے اخلاقی تقاضے پورے کر کے محنت مزدوری کی، گھر بنایا پھر شادی کی اور اولاد کے فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔ چوں کہ ان کے ذہن میں دنیا مسافر خانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کر کے مقصدِ حیات تلاش کیا۔ مقصدِ حیات میں اس بات کی نشان دہی ہوئی کہ سکون زندگی کا حاصل ہے اور سکون حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دنیا کو فانی سمجھا جائے۔

قناعت بھائی کو تلاش ہوئی کہ ایسا بندہ مل جائے جو سکون سے واقف ہو اور خود بھی پُرسکون ہو۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کے لئے جدوجہد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر ہدایت کے راستے کھول دیتا ہے۔

مسلسل تلاش، جدوجہد اور کوشش سے قناعت بھائی ایسا استاد تلاش کرنے میں کام یاب ہو گئے جو جانتا تھا کہ فی الواقع سکون اور خوشی کیا ہے۔

سکون آشنا استاد نے پہلا درس یہ دیا کہ زندگی میں وہ لمحات تلاش کرو جن میں تم پُرسکون رہ چکے ہو۔ اس زمانے کا کھوج لگاؤ جس میں تم پر خوف نہیں تھا۔ اس دور کو ڈھونڈو جس میں تم واقف ہی نہیں تھے کہ غم کیا ہے۔ اور یہ تمہاری پیدائش کے دن سے 12 سال کی عمر تک کا دور ہے۔

سکون آشنا استاد نے طالب علم کی دستگیری کی کہ جب تم پہلے دن کے بچے تھے تو تمہاری حیثیت دنیا کی پوری آبادی سے منفرد تھی کیوں کہ تمہیں خوف اور غم نہیں تھا۔

ماہرین شماریات اس وقت دنیا کی آبادی تقریباً ساڑھے سات ارب بتاتے ہیں۔ ان میں 12 سال کی عمر کے بچوں کے بعد تقریباً ہر شخص بے چین، مضطرب اور پریشان ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ 12 سال کی عمر کے بعد ہر شخص بے سکون، پریشان اور

بے یقینی کے گرداب میں ہے۔

قناعت بھائی سکون آشنا استاد کے سچے پکے شاگرد تھے۔ استاد کی راہ نمائی میں مستقبل کے اندیشوں کو نظر انداز کر کے ماضی کے خوش نما ماحول میں سفر کرنا شروع کیا۔ ان باتوں سے بغاوت کردی جو آدمی کو بے سکون کرتی ہیں اور مہلک امراض میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ جو انسان کو اپنی ذات سے نا آشنا کر کے جھوٹی انا کے خول میں بند کر دیتی ہیں۔

موسم خوش گوار اور ہوا خنک تھی۔ آسمان پر بادل تیر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی بارش برسے گی۔دونوں کردار جمع ہوئے اور روداد سنائی۔ اضطراب بھائی کی مضطرب زندگی میں بے یقینی، شک، خوف اور غم کے واقعات تھے۔

قناعت بھائی نے اپنی روداد سنائی جس میں ایمان تھا —— ایقان تھا —— خوشی تھی اور فطرت سے والہانہ اتصال تھا۔

جس جگہ ان کی ملاقات ہوئی وہ پُر فضا مقام تھا۔ گھاس کے مخملیں قالین تھے، خوش نما روشیں تھیں، گلاب کے تختے تھے، قطار در قطار پھول تھے، عجیب سماں تھا جہاں سکون کی لہریں اندر میں اتر رہی تھیں۔ رنگ رنگ پھولوں پر تتلیاں اُڑ رہی تھیں، ہوا درخت کے پتّوں میں ساز بجا رہی تھی۔

اضطراب نے بے چینی سے پہلو بدلا اور قناعت کے دامن میں چھپ کر سکون کا سانس لیا۔

قناعت نے بتایا —— یہ میرا گھر ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے، دن کو روشنی اور رات کو نور برستا ہے، اور ہر طرف پھولوں کی بہار ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت ہے کہ پھول لوگوں کے لئے رنگ اور خوش بو پھیلا رہے ہیں تاکہ لوگ فطرت کے حسن کا نظارہ کریں، بے چینی کو پھولوں کی خوش بو سے دھو ڈالیں۔ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے جس نے مخلوقات کو خوش رکھنے کے لئے بے شمار چیزیں تخلیق کی ہیں۔ تخلیقی عجائبات دیکھنے اور سمجھنے کے لئے ہمارے سامنے فطرت ہے۔ جب کوئی شخص فطرت سے ہم آغوش ہو جاتا ہے تو اس کے اندر تبدیلی آتی ہے، اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ اس کا ذہن فانی اشیا سے ہٹ کر باقی رہنے والی ہستی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

آپ نے اضطراب اور قناعت دو کردار پڑھے۔ بہت کچھ سمجھا، بہت کچھ سوچا، فنا اور بقا کا فلسفہ ذہن نشین ہوا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اضطراب اور پریشانی سے محفوظ رکھے اور قناعت کی دولت سے مالا مال کرے، آمین۔

خواجہ شمس الدین عظیمی

پیراسائیکالوجی سے مسائل کا حل

پیراسائیکالوجی کے تحت دیئے گئے علاج کے لئے اجازت ضروری ہے۔ کوئی صاحب یا صاحبہ اجازت کے بغیر علاج نہ کریں۔ (ادارہ)

ایثار

ف۔د (مظفر گڑھ): چند سال پہلے تک ہم صاحبِ حیثیت لوگوں میں سے تھے۔ کاروبار اچھا چل رہا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا، روز بروز نقصان ہونے لگا۔ جو فیصلہ کرتے، نتیجہ الٹ نکلتا۔ صدقہ خیرات کرنے والے لوگ تھے، اب لاکھوں کے مقروض ہیں۔ گھر میں سب صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ ہمارے خاندان میں اس اصول پر سختی سے عمل ہوتا ہے کہ گھر میں حرام رزق نہ آئے۔ ہم جائز ذرائع سے پیسہ کماتے ہیں لیکن قسمت ایسے روٹھی ہے کہ......! اب تک غلط راستہ نہیں اپنایا پھر بھی بہتری کے آثار نہیں اور نتائج منفی ہیں۔ فی الوقت ذہن تقسیم ہو گیا ہے کہ آیا ناجائز ذریعے سے کاروبار کو وسعت دیں یا اللہ پر بھروسا کر کے کام کرتے رہیں۔

جواب: محترم بھائی! بنیادی حقوق دو ہیں۔

۱۔ حقوق اللہ ۲۔ حقوق العباد

رازق و کفیل اللہ تعالیٰ بندے پر فضل فرماتا ہے تو بندے پر اللہ کی مخلوق کے حقوق بھی عائد ہوتے ہیں۔ آدمی کسی مسئلے سے دوچار ہو تو اسے اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لینا چاہئے اور ضمیر کی روشنی میں اپنا محاسبہ کرنا چاہئے۔ آپ حضرات سے حقوق العباد کی ادائیگی میں بہت کوتاہی ہوئی ہے۔ اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے اللہ کی مخلوق پر خرچ نہ کیا جائے تو وہی ہوتا ہے جو آپ کے ساتھ ہوا۔ شعور میں ایثار کے معاملے میں جمود پیدا ہو گیا ہے، اسے ختم کرنا ہے۔ اللہ کے حضور صدقِ دل سے توبہ کیجئے اور مخلوق کے لئے ایثار اپنایئے۔

جس علاقے سے آپ کا تعلق ہے وہاں قریب کوئی تالاب، نہر یا دریا ہو گا۔ پتنگ کے کاغذ کی دو شیٹ لیجئے۔ نمازِ فجر کے بعد کسی سے گفتگو کئے بغیر اس کاغذ پر سیاہ روشنائی سے چھوٹے چھوٹے

"الف" لکھئے۔ ہر دو الف کے درمیان اتنا فاصلہ ہو کہ قینچی سے الگ الگ کاٹ سکیں۔ الف لکھنے سے شعور پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، وضاحت کی کالم میں گنجائش نہیں۔ لکھنے کے لئے قلم باریک ہو تاکہ کاغذ پر خراش نہ آئے۔

کاغذ کے ٹکڑوں کی گولیاں بنایئے اور ہر گولی کو گوندھے ہوئے آٹے میں لپیٹ کر خشک کرنے رکھئے۔ یہ مچھلیوں کی خوراک بن گئی۔

پورے عمل کے دوران یعنی لکھنے، گولیاں بنانے اور انہیں دریا، نہر یا تالاب میں ڈالتے وقت شدید ضرورت کے سوا بات کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ عمل خاندان کا کوئی بھی فرد کر سکتا ہے۔

یہ مت سمجھئے کہ تین ماہ میں کاروبار تیزی سے ترقی کرے گا۔ ترقی کا انحصار شعور کی وہ گرہ کھلنے پر ہے جو ایثار نہ ہونے کی وجہ سے لگ گئی ہے۔ اللہ نے چاہا تو گرہ چند روز میں بھی کھل سکتی ہے۔ عمل کے لئے تین مہینے کا وقت مناسب ہے جب کہ ایثار زندگی بھر کا ہے۔

دوسرا نہ دیکھے

شہریار احمد (لاہور): سننے والوں کو میرے الفاظ سمجھ میں نہیں آتے۔ ہر بات دہرانی پڑتی ہے۔ میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ زمانۂ طالب علمی میں زبان کا یہ حال ہے تو پیشہ ورانہ امور کی ادائیگی میں ڈاکٹر کی بات مریض کیسے سمجھے گا؟ زبان کی روانی کی مشقیں کر چکا ہوں مگر ایسا لگتا ہے کہ مسئلہ زبان سے زیادہ ذہن کا ہے۔

جواب : "12 X 9" سفید چکنے کاغذ پر، کچی پنسل سے اپنا خاکہ بنا کر، خاکے کی لکیروں پر سیاہ چمک دار روشنائی سے نقطے بنایئے۔ پھر پنسل سے بنائی گئی لکیروں کو مٹا دیجئے۔ اب نقطے باقی رہ گئے۔ نقطوں کے درمیان میں جو حصہ خالی رہ جائے اسے بھی نقطوں سے بھر کر کاغذ کو شفاف شیشے کے ساتھ فریم کروا لیجئے۔ فریم کی لکڑی کا رنگ سیاہ ہو۔

گھڑی دیکھ کر روزانہ پانچ منٹ پانچ سیکنڈ تک ان نقطوں کو چار فٹ کے فاصلے سے دیکھئے، جب تک مسئلہ حل نہ ہو جائے۔ خیال رہے کہ آپ کا فریم صرف آپ کے استعمال میں ہو۔ دوسرا فرد اس کو نظر جما کر نہ دیکھے۔

تین طشتریاں

ماہ رخ (کوٹ اڈو): کچھ عرصہ پہلے طبیعت خراب ہوئی، ٹیسٹ کرنے پر پتہ چلا کہ تلی اور جگر کا سائز بڑھ گیا ہے۔ بخار بھی ہوتا تھا۔ علاج سے اللہ کا کرم ہے کہ شفا ہوئی۔ اب مرض دوبارہ سر اٹھا رہا ہے۔ ڈاکٹری علاج شروع کر دیا ہے۔ کیا پیرا سائیکالوجی میں اس کا علاج ہے؟

جواب: چینی کی تین طشتریاں لکڑی کی میز پر رکھئے۔ چھوٹے چمچ سے تینوں طشتریوں کے کناروں پر ٹھہر ٹھہر کر ضرب لگایئے اور جو ساز

سنائی دے، غور سے سنئے۔ ساز سننے کا عمل رات کو سوتے وقت اور دوپہر کو 15 منٹ بلاناغہ کرنا ہے۔ ساز سننے کے لئے تنہائی اور ہلکا اندھیرا ضروری ہے۔ آپ کی خوراک میں پرہیز نہیں ہے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق پرہیز کیجئے۔

دلدل

م۔ش (ساہیوال): میری صلاحیتیں مفلوج ہوگئی ہیں۔ ہر وقت ذہن آلودہ رہتا ہے۔ سمجھ لیجئے کہ گمراہی کی دلدل میں ہوں، جتنا نکلنے کی کوشش کرتا ہوں، دلدل کھینچ لیتی ہے۔ ذہن کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا، دن بدن دبلا ہو رہا ہوں۔

جواب: اپنی تصویر کا نیگیٹو بنوا کر فوٹو کی طرح فریم کر کے دیوار پر لٹکائیے۔ فوٹو گرافر اس بات کا دھیان رکھے کہ نیگیٹو پر نشان یا رنگ نہ ہو۔ تین فٹ کے فاصلے سے دن رات میں پانچ مرتبہ 10، 10 منٹ تک دیکھنا ہے۔ اس طرح 24 گھنٹے میں 50 منٹ ہوئے۔ مشق کی مدت 33 روز ہے۔

اللہ میرے ساتھ ہے

عنبرین صدیقی (قطر): شادی کو دس سال ہو چکے ہیں۔ بھرے گھر میں تنہا ہوں۔ رات میں آنکھ کھلتی ہے تو دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں۔ چیخ چیخ کر رونے کو دل کرتا ہے لیکن آواز حلق میں رہ جاتی ہے۔ پتہ نہیں گھر میں ویرانی ہے کہ دل ویران ہے۔ تنہائی نہیں ہوتی تو تنہائی کا خوف رہتا ہے۔ نماز روزے کی پابند ہوں۔ سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں

ماہنامہ قلندر شعور دسمبر 2020ء

پیراسائیکالوجی
(Parapsychology)

اماں کا نام : .... سائل کا نام: ....

تاریخ اور وقت پیدائش : .... تعلیم: .... ازدواجی حیثیت: ....

جاگنے کا دورانیہ : .... سانس کا دورانیہ کتنے سیکنڈ ہے: ....

کھانا پیٹ بھر کے کھاتے ہیں یا بھوک رکھ کر: .... نمک زیادہ پسند ہے یا مٹھاس: ....

خیالات میں حقیقت پسندی ہے یا الوژن : .... دستخط : ....

خط و کتابت کا پتہ : ....

.... رابطہ نمبر: ....

لیکن خود اداس ہوں۔ خدارا راہ نمائی کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ ساری عمر تنہا رہ جاؤں۔

جواب: آدمی کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ وہ جہاں اور جس مقام پر ہے، اللہ اس کے ساتھ ہے اور رگِ جان سے زیادہ قریب ہے۔ اللہ اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے، باطن ہے۔ یقین مستحکم ہونے سے تعلق مشاہدہ بنتا ہے اور بندہ خود کو تنہا نہیں سمجھتا۔ اللہ نے آپ کو اچھی زندگی گزارنے کے وسائل عطا فرمائے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ شکر کیجئے۔ اللہ کا شکر ادا کرنے سے وسوسے دور ہوتے ہیں۔ فجر کی نماز کے بعد آنکھیں بند کرکے آرام دہ نشست میں 10 منٹ تک تصور کیجئے کہ اللہ میرے ساتھ ہے اور میں اللہ کے حضور حاضر ہوں۔

درخت کا تنا

شکیل (نواب شاہ): شدید احساسِ کم تری میں مبتلا ہوں۔ گھبراہٹ چھپانے کے لئے طرح طرح کے منہ بناتا ہوں۔ میری شخصیت دب گئی ہے۔

جواب: صبح سویرے ننگے پیر گھر کے قریب موجود درخت کے تنے سے پشت لگاکر کھڑے ہوجایئے۔ ریڑھ کی ہڈی درخت سے لگی رہے۔ نظریں سیدھے پیر کے انگوٹھے پر رہیں۔ دس منٹ تک اسی طرح کھڑے رہئے۔ اس کے بعد روزمرہ امور انجام دیجئے۔ ایک دفعہ جس درخت کا انتخاب کیا جائے، 40 روز اسی درخت کے تنے سے لگ کر کھڑے ہونا ہے۔

شمع کی لَو

بادشاہ نے مشیرِ خاص سے کہا، میں 75 برس کا ہو چکا ہوں۔ جوانی میں کتب بینی کرتا تھا۔ کبھی کبھار جی چاہتا ہے کہ دوبارہ کتاب اٹھاؤں لیکن سوچتا ہوں اس عمر میں مطالعے کا کیا فائدہ۔
مشیر دربارِ شاہی میں سب سے دانا اور دور اندیش تھا مگر—— نابینا تھا۔
اس نے کہا، آپ شمع کیوں نہیں جلاتے؟
بات گہری تھی۔ بادشاہ کو مفہوم سمجھ میں نہیں آیا۔ ناگواری سے کہا، مجھ سے مذاق کرتے ہو؟
اس نے وضاحت کی، اندھا مشیر یہ جسارت کیوں کرے گا؟ کہتے ہیں کہ جو شخص جوانی میں مطالعے کا شوقین ہو، اس کا مستقبل طلوعِ آفتاب کی مانند ہوتا ہے، ادھیڑ عمری میں مطالعہ آفتاب نصف النہار کی مثل ہے جب کہ بڑھاپے میں مطالعہ شمع کی لَو جیسا ہے۔ شمع کی لَو زیادہ روشن نہیں ہوتی پھر بھی گھپ اندھیرے سے کہیں درجے بہتر ہے۔

صوفیہ رفعت (برطانیہ)

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

نجانے یہ کیسا طائر تھا کہ اس کے جانے کے بعد کئی سوال ذہن میں گردش کرتے رہے۔ سبق ملا کہ اگر ہم اپنے باطن کی آواز سنیں اور اس پر عمل کریں تو وقت پر صحیح فیصلہ کریں گے اور خود کو تکلیف سے بچا کر دوسروں کے درد کا درماں بنیں گے۔

ذکر ہے ایک سہانی صبح کا جب میں معمول کے مطابق باغیچے کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ مجھے فطرت کے قریب رہنا پسند ہے۔ فطرت کا ایک حصہ پودوں، پرندوں، پہاڑوں اور دریاؤں کی شکل میں ہے اور دوسرا ہمارے اندر ہے جسے خوشی — کہتے ہیں۔ جی ہاں! کیسے بھی حالات ہوں، الحمدللہ! میں فطرت سے قریب رہ کر ان کا مقابلہ کرتی ہوں، خوشی کو ناخوش نہیں ہونے دیتی۔

میں پودوں کو پانی دے کر ان سے باتیں کرتے ہوئے، قدرت کی نعمتوں پر اندر باہر خوشی سے سرشار تھی کہ خیال آیا ـــــ اکثر تند و تیز ہوا سے باغیچے میں رکھی ہوئی اشیا الٹ جاتی ہیں اس لئے باربی کیو گرل جو چار دن پہلے اسٹور روم سے باہر نکال کر رکھا تھا، واپس رکھ دینا چاہیئے۔ اگلے لمحے خیال کو نظر انداز کر دیا کہ بعد میں رکھ دوں گی، اور پورا دن مصروفیت میں گزر گیا۔

دوسرے روز وہی خیال دوبارہ آیا۔ میں نے اہمیت نہیں دی تو بازگشت شروع ہو گئی۔ تکرار سے ذہن بوجھل ہونے لگا تو باربی کیو گرل بمشکل دھکیل کر کھڑکی کے سامنے لے آئی تاکہ اس پر نظر پڑتی رہے اور جیسے ہی کوئی آئے، اس کی مدد سے اسٹور روم میں رکھوا دوں۔ شام میں سب گھر پر تھے مگر گرل کی طرف ذہن نہیں گیا۔

تیسرا دن تھا۔ حسبِ معمول گھر کے کاموں میں مصروف تھی کہ خیال خود کو دہرانے لگا۔ نگاہ بے اختیار بار بار اسٹور روم کی طرف اٹھ رہی تھی۔ میں نے ہمت کر کے باربی کیو گرل دھکیل کر اسٹور روم کے قریب رکھ دیا کہ افرادِ خانہ کے گھر لوٹتے ہی رکھوا دوں گی۔

اصل میں اسٹور روم باغیچے سے قدرے اوپر ہے، میں تن تنہا باربی کیو گرل وہاں تک نہیں لے جا سکتی تھی۔ گرنے کا ڈر تھا۔ سب کی گھر آمد کے

بعد گھما گھمی میں بھول جاتی تھی۔ بدقسمتی سے تیسرے دن بھی خیال پر عمل نہ ہو سکا۔

چوتھے دن کا آغاز ہمیشہ کی طرح شاداں و فرحاں ربِ کائنات کی حمد و ثنا سے کیا۔ الحمدللہ دل ہمیشہ خالق کی نعمتوں پر مسرور رہتا ہے۔ گھریلو مصروفیات کا آغاز کیا ہی تھا کہ پھر خیال نے دستک دی اور آج اس میں اتنی شدت تھی کہ مجھے سارے کام غیر اہم لگے۔

قفسِ عنصری میں چھپے ہوئے وجود نے باربی کیو گرل کی طرف قدم بڑھایا۔ میں نے انجانی قوت کے تحت اسے دھکیلنا شروع کیا اور جیسے ہو سکا، اسٹور روم کے دروازے تک لے آئی۔ خیال پر عمل کرنے سے اگرچہ جسمانی طور پر مشقت اٹھانی پڑی لیکن تین دن کا بوجھ دل پر سے اتر گیا۔

لکڑی سے بنا ہوا سبز پینٹ سے مزین دروازہ کھولا تو سامنے منظر دیکھ کر پلکیں جھپکنا بھول گئیں اور آواز حلق میں رہ گئی۔ ذہن یک دم خالی ہو گیا۔ نگاہِ حیرت نے معصوم خوب صورت پرندہ دیکھا۔ سبز اور سلیٹی رنگوں کا امتزاج لئے قدرت کا حسین شاہکار خود کو پروں میں سمیٹے ہوئے چار دن سے کسی کی آمد کا منتظر تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اسٹور روم میں روشنی داخل ہوئی تو پرندہ خبردار ہو گیا۔ نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور وہ خاموش تھا۔ نجانے اس خاموشی میں ایسا کیا تھا کہ جب کبھی اس بارے میں سوچتی ہوں تو ذہن خالی ہو جاتا ہے اور لکھنے کی کوشش کرتی ہوں تو الفاظ نہیں ملتے۔

میں سامنے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گئی۔

اس کے جسم میں حرکت ہوئی، سبز و سلیٹی پر پھڑپھڑائے اور اگلے لمحے اڑان بھر کر وہ فضائے چمن میں پرواز کرتے ہوئے زور زور سے چہکنے لگا جیسے آزادی ملنے اور زندگی کا تسلسل جاری رہنے کی نوید پر رب تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہو۔ پرندے کی چہکار میں ایسی کشش تھی کہ سماعت، بصارت، قلب و ذہن سب نے آواز میں چھپی ہوئی خوشی کو محسوس کیا اور دل نے چپکے سے آزادی مبارک کہا۔

میری ناقص عقل کو آواز پر عمل کرنے میں دیر لگی۔ اللہ کا شکر ہے کہ پرندے کی جان بچ گئی۔

ننھا پرندہ نغمۂ تشکر اور آزادی کا گیت گا کر کب کا جا چکا تھا اور میں پریشان تھی۔ اس کی تکلیف کا سوچ کر عجیب درد محسوس ہوا کہ بے چارے نے تین دن بھوک پیاس اور قید کی صعوبت برداشت کی، گھر سے دور، ساتھیوں سے جدا کس حال میں رہا ہوگا۔ اسٹور روم بند رہتا ہے پھر یہ کب اور کیسے داخل ہوا اور کسی نے دیکھا کیوں نہیں؟

ہم اسٹور روم بوقت ضرورت کھول کر اسی وقت بند کر دیتے ہیں، اس خطرے کے پیشِ نظر کہ آس

پاس گھروں کی پالتو بلی یا آوارہ لومڑی اندر نہ چلی جائے۔ ہمیں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔

حافظے پر زور دینے سے یاد آیا کہ آخری مرتبہ اسٹور روم باربی کیو گرل نکالنے کے لئے چار دن پہلے کھولا تھا جب گھر میں مہمان تھے۔ ہم دروازہ بند کرنا بھول گئے تھے۔ خیال آنے پر رات کو بند کیا۔ بھولا بھالا پرندہ موقع پا کر اندر چلا گیا اور تین شب و روز قید میں رہ کر چوتھی صبح اس نے روشنی دیکھی۔ اس دوران قدرت ننھی مخلوق کی مدد کے لئے مجھے مسلسل انسپائر کرتی رہی اور چوتھے روز انجانی قوت کے تحت وہاں لے گئی۔ اگر میں نے پہلے روز لاشعور سے آنے والی اطلاع پر عمل کیا ہوتا تو ننھا پرندہ تکلیف سے بچ جاتا۔

اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ سوچتی، ماضی میں پڑھی ہوئی نظم ذہن کی اسکرین پر منعکس ہوئی اور جنبشِ لب سے ماحول میں بکھر کر ننھے پرندے کے غم کی ترجمانی کی۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا
آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں
کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں، میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں
اس قید کا الٰہی! دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں، میں غم سے مر نہ جاؤں
جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے
آزاد مجھ کو کردے او قید کرنے والے!
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

پرندے کی مدد کے مشاہدے سے شفیق و مہربان ہستی اللہ پر میرا یقین مضبوط ہوا۔ قدرت کے لئے اسے بند کمرے سے نکالنا مشکل نہیں تھا، یہ کام ہمیں خبر کئے بغیر بھی ہو سکتا تھا۔ ہم پرندے کی اسٹور روم میں موجودگی سے بے خبر تھے، اس کے نکلنے سے بھی بے خبر رہتے لیکن قدرت ہمیں کچھ سکھانا چاہتی تھی، کچھ سمجھانا چاہتی تھی۔

گزشتہ تین دن کی فلم ذہن میں گھوم گئی۔ میں اپنے کاموں میں مشغول رہ کر خیال پر عمل کو مؤخر کرتی رہی جب کہ پرندہ اس دوران قدرت سے مسلسل ربط میں تھا اور مہربان قدرت نے اسے تنہا

نہیں چھوڑا۔ توجہ ذاتِ باری تعالیٰ کے فرمان کی طرف مبذول ہوگئی،

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے۔ اور یہ جو کچھ کرتے ہیں، اللہ اس سے باخبر ہے۔" (النور: ۴۱)

ہر شے اللہ کی تسبیح کرتی ہے، سب کو اپنی عبادت کا طریقہ معلوم ہے اور اللہ سب سے باخبر ہے۔ ان الفاظ نے طمانیت کے خوب صورت احساس سے سرشار کر دیا۔ خالق و مالک اللہ مخلوق کی احتیاج، دکھ درد اور خوشی سے واقف ہے۔ وہ شہ رگ سے زیادہ قریب مہربان ہستی ہے ۔ اس نے مخلوق کو محبت کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ وہ روشنی اور تاریکی دونوں میں ہماری نگرانی و نگہبانی کرتا ہے۔ اس کے کرم کا دائرہ سب پر محیط ہے۔ کوئی سائل تو بنے!

پرندہ بارگاہِ الٰہی میں بھوک پیاس اور قید کی تکلیف سے نجات کا سائل تھا۔ اللہ جانے اس کے کھانے پینے کا انتظام کیسے ہوا؟

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے سب کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ ہر مخلوق اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ کبوتر غٹرغوں کرتا ہے، طوطا ٹیں ٹیں کرتا ہے، مختلف جانور اپنی اپنی بولی بولتے ہیں۔ صبح جب کسی جنگل یا ویرانے میں یا کسی باغ میں چلے جائیں چڑیوں کی چہکار سنائی دیتی ہے۔ پرندے شام کو گھونسلے میں چلے جاتے ہیں اور مغرب کے بعد بالکل خاموشی چھا جاتی ہے۔"

پرندے نے آزادی کی نعمت چھن جانے پر مایوسی کے بجائے معمول کی طرح اپنی نماز ادا کی ہوگی، اللہ کی عبادت کی ہوگی اور ذہن کو ربِ کائنات پر مرتکز کرنے کے لئے مراقبہ کیا ہوگا۔ ہر مخلوق رب سے تعلق کی وجہ سے زندہ ہے۔ مایوسی بندے کو مایوس کر دیتی ہے۔ پرندہ مایوس نہیں ہوا، اسی لئے چوتھے دن حیات تھا۔

نجانے یہ کیسا طائر تھا کہ اس کے جانے کے بعد کئی سوال ذہن میں گردش کرتے رہے۔ سبق ملا کہ اگر ہم باطن کی آواز سنیں اور اس پر عمل کریں تو وقت پر صحیح فیصلہ کریں گے اور خود کو تکلیف سے بچا کر دوسروں کے درد کا درماں بنیں گے۔

پرندے کی طرح ہم بھی اس دنیا میں قید میں ہیں اور اصل وطن سے دور ہیں۔ ننھی مخلوق کی آواز جس ذریعے سے مجھ تک پہنچی، اس نے سکھایا کہ وطن* سے دربدر لوگ خالق سے لوَ لگا کر ہی وطن لوٹ سکتے ہیں۔

---

* وطن (جنت)

خالدہ زبیر

مضمون کا عنوان قارئین بتائیں

ایک مثال گھر میں نیلے یا سبز رنگ آنکھوں والے بچے کی پیدائش ہے۔ماں باپ اور موجود رشتہ داروں میں سب کی آنکھوں کا رنگ بھورا یا سیاہ ہے۔ بچے نے کس کی آنکھوں کا رنگ لیا— ؟ بالآخر معلوم ہوا کہ پَر دادی کی اماں کی آنکھیں نیلی تھیں۔

ماریہ پُرسکون گھرانے سے شوروغل اور ہنگامہ خیز ماحول میں آئی تو پہلے پہل دل بہت گھبرایا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ماں سے شکوہ کیا۔

ماں نے کہا، بیٹی! ہر گھر کا ماحول مختلف ہوتا ہے۔ ماحول سمجھنے کے بعد اس کو بہتر کرنے کی کوشش کرنا اب تمہاری ذمہ داری ہے۔ آئندہ مجھ سے شکوہ نہ کرنا، ہاں! راہ نمائی کے لئے موجود ہوں۔

ماں کی طرف سے صاف جواب سن کر مزید کچھ کہنے کا حوصلہ نہ رہا۔ شام کو شوہر لینے آئے تو سب نے محبت اور دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

سسرال پہنچنے پر حسبِ توقع شوروغل کے ساتھ دیور کے بچوں نے چچی جان کا استقبال کیا۔ بچوں کی محبت دیکھ کر وہ ان کے ساتھ گھل مل گئی۔

وقت اچھا گزرنے لگا۔ بچے محبت کرنے والے تھے مگر گھر والوں کا چیخ کر بات کرنا، ادب کا خیال نہ رکھنا، بے مقصد باتوں پر گھنٹوں بحث اور آخر میں تکرار معمول تھا۔ بچے ہو بہو بڑوں کی تصویر تھے لہٰذا گھر سے سکون رخصت تھا۔

شوہر سے ہم آہنگی ہوئی تو پریشانی کا اظہار کیا۔

وہ ہنس کر بولے، ارے ہم زندہ دل لوگ ہیں، کھاتے پیتے اور خوش رہتے ہیں، یہی زندگی ہے۔

سن کر دکھ ہوا کہ "یہی زندگی ہے"۔

جس ماحول سے وہ آئی تھی، وہاں زندگی بندگی کے سوا کچھ نہ تھی۔ بڑے چھوٹے کا ادب واحترام تھا۔ دھیمے لہجے میں بات کی جاتی تھی۔ سسرال میں خوشی کے نئے مفہوم کو ذہن نے قبول نہیں کیا۔ ماں سے اظہار کی جرأت نہ تھی۔ ماریہ نے بچوں کو خود سے قریب کر کے تبدیلی کا آغاز کیا۔ تبدیلی کے لئے قربت ضروری ہے کیوں کہ قربت سے عکس منتقل ہوتا ہے۔

بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے یعنی ہر بچہ ایک

ذہن لے کر دنیا میں آتا ہے پھر ذہن تبدیل کیوں ہو جاتے ہیں؟ حتیٰ کہ ایک ماں باپ سے پیدا ہونے والے بچوں کا ذہن ایک نہیں ہوتا۔ اختلاف کہاں سے آیا اور وہ ذہن کہاں گیا جو سب میں ایک ہے اور پیدائش کے وقت غالب تھا؟

ہم سب اماں حوا کی اولاد ہیں۔ نوعِ آدم کو جنت میں نافرمانی کی وجہ سے زمین پر آنا پڑا۔ یہاں سے نافرمانی کا ریکارڈ متحرک ہوا۔ جب ہابیل اور قابیل کا معاملہ پیش آیا تو زمین پر فرماں برداری اور نافرمانی کے ریکارڈ کا مظاہرہ ہوا۔ ایک نے فطرت کی آواز سنی، دوسرے نے انکار کر دیا۔ نتیجے میں ہابیل کے جین میں مثبت ریکارڈ اور قابیل کے جین میں منفی طرز غالب ہو گئی۔

جین وہ scanner ہے جو ہر لفظ، سوچ اور طرزِ عمل scan کر کے DNA کو منتقل کرتا ہے۔

ماں باپ کی طرزِ فکر سے، اور ماحول کے مطابق جس کردار کو غالب ہونے کا موقع ملتا ہے وہ ظاہر ہوتا ہے — باقی نقوش مغلوب ہو جاتے ہیں۔ مغلوب رخ ختم نہیں ہوتا — نظام کا حصہ ہے۔ جب تک نظام ہے، ابتدا سے لے کر آخر تک ہر شے موجود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈی این اے آباؤ اجداد کے ریکارڈ کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتا ہے۔ ایک مثال گھر میں نیلے یا سبز رنگ آنکھوں والے بچے کی پیدائش ہے۔ ماں باپ اور موجود رشتہ داروں میں سب کی آنکھوں کا رنگ بھورا یا سیاہ ہے۔ بچے نے کس کی آنکھوں کا رنگ لیا — ؟ بالآخر معلوم ہوا کہ پَردادی کی اماں کی آنکھیں نیلی تھیں۔

تحقیق و تلاش (سائنس) کے مطابق ہر فرد کا جینیاتی مادہ 99 فی صد یکساں ہے۔ باقی ایک فی صد ماحول کے تابع ہے اور اسی ایک فی صد کی وجہ سے شکل و صورت اور عمل و کردار بدلتا ہے۔

افریقی باشندوں کی ساخت اور رنگ وہاں کی آب و ہوا کے مطابق ہے جب کہ جرمن قوم کی رنگت اپنے خطے کی آب و فضا کی عکاس ہے۔ ذہن ماحول کی لہریں قبول کرتا ہے تو جین میں ارتقا کے عمل سے انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔ یہ انفرادیت جینیاتی مادے میں ایک فی صد تبدیلی کی وجہ سے ہے ورنہ 99 فی صد مادہ اجتماعی سوچ کا حامل اور فطرت کے مطابق ہے۔

مثال: ماں باپ کا کردار اعلیٰ ہو یا ذہن ماحول کی چھاپ کے زیرِ اثر ادنیٰ ہو، اولاد 99 فی صد یکساں جنیوم کے زیرِ اثر ساخت اور خواص کے لحاظ سے ایک ہوتی ہے۔ اب ایک فی صد جنیوم کا جائزہ لیتے ہیں۔ اگر ماں باپ میں کوئی جسمانی نقص ہے تو وہ ایک فی صد جینیاتی مادے کے ذریعے بچے میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح خدوخال اور قول و فعل بھی

جین میں پرنٹ ہوتے ہیں۔ بچے کا ذہن کورا کاغذ ہے۔ کاغذ پر جو تحریر مدہم ہوگئی ہے وہ وہاں کی زندگی سے متعلق ہے جہاں سے بچہ آیا ہے۔ اب اس کاغذ پر والدین اور ماحول کی تربیت سے جو تحریر لکھی جائے گی، بچہ اس کی تصویر ہے۔

یہ درست ہے کہ بچے کو آباؤ اجداد کے جین منتقل ہوتے ہیں مگر ظاہر ماحول کے مطابق ہوتے ہیں۔ پیغمبر نوحؑ کے بیٹے نے والد کی طرز فکر کے بجائے ماحول کا اثر قبول کیا جب کہ والد کی غیر جانب دار طرز فکر اس کے جین میں ریکارڈ تھی۔

ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بچے نے ایک فی صد جینیاتی مادے کے بجائے 99 فی صد کا ریکارڈ قبول کیا۔ یہ 99 فی صد ریکارڈ کائناتی شعور ہے جس میں معرفتِ ذات اور تخلیقی فارمولوں کا علم ہے۔

ابوالانبیا حضرت ابراہیمؑ نے بت پرست ماحول کے اثر کو رد کر دیا اور کائناتی طرز فکر اپنائی۔ اس طرح ایک فی صد جین کی انفرادیت 99 فی صد جینیوم پر غالب نہ آسکی۔ باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

”کہو، اللہ نے جو فرمایا ہے، سچ فرمایا ہے۔ تم کو یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرنی چاہئے اور ابراہیمؑ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔“ (اٰل عمرٰن:۹۵)

تربیت اور ماحول دینِ فطرت کے مطابق نہ ہو تو نافرمانی کا جین غالب ہونے سے غیر جانب داری مغلوب ہو جاتی ہے۔ استادِ محترم فرماتے ہیں،

”غیر جانب دار طرز فکر ہر آدمی کے اندر موجود ہے مگر ہر آدمی اسے استعمال نہیں کرتا۔“

محققین کے لئے یہ سوال اہم رہا ہے کہ کیا جین خارجی حالات و کیفیات سے متاثر ہوتا ہے؟ تحقیق کا دائرہ وسیع ہونے پر تجربات و مشاہدات سامنے آئے کہ ماحول کے ذریعے رنگ، روپ اور دیگر صفات متاثر ہوتی ہیں۔

جس طرح انسانوں کی دنیا میں ماحول بدلنے سے رنگ بدلتا ہے، اسی طرح اگر کوئی جانور دوسرے جانور کے گروہ میں رہنے لگے تو گروہ کی خصوصیات رفتہ رفتہ اس کے جین میں داخل ہو جاتی ہیں۔

ایک تمثیل پڑھئے۔

کسی جنگل میں بکریوں کے ریوڑ میں شیر کا بچہ شامل ہو گیا جسے دیکھ کر اماں بکری کے اندر ممتا کے جذبات نے کروٹ لی۔ خیال تھا کہ ابھی شیرنی آئے گی اور بچے کو لے جائے گی۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی مگر کوئی نہیں آیا۔ بچہ بھوکا پیاسا تھا۔ اماں بکری نے تھن بچے کے سامنے کر دیئے۔ بچے نے سیر ہو کر دودھ پیا۔ بکری اسے ساتھ لے آئی، پرورش کی اور وہ بکریوں کی برادری

کا فرد بن گیا۔ ایک روز شیر شکار کے لئے کچھار سے نکلا۔ اسے بکریوں کے ریوڑ میں شیر نظر آیا جس نے بکریوں کے اوصاف اپنا لئے تھے۔ آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ غصے سے دھاڑا۔ جنگل میں جانور اور پرندے سہم گئے۔ بکریوں نے دوڑ لگائی۔ چھوٹا شیر ان کے ساتھ دوڑا۔ بڑے شیر نے تعاقب کیا اور جلد ہی اسے دبوچ کر کچھار میں لے گیا۔ بتایا کہ تو بکری نہیں جنگل کا بادشاہ شیر ہے، برادری کی بہادری کے قصے سنائے مگر چھوٹے شیر کو بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بات کرتا تو آدھی آواز بکری اور آدھی شیر جیسی ہوتی۔ بڑے شیر کے پاس ایک ہی راستہ تھا۔ اسے تالاب پر لے گیا جہاں پانی میں دو ایک جیسے عکس دیکھ کر چھوٹے شیر پر حقیقت واضح ہوئی۔ بالآخر اپنی برادری میں لوٹ کر اس میں شیروں کی خصوصیات بیدار ہوئیں۔

تمثیل لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ بکریوں کے ساتھ رہ کر شیر بھی بکری بن جاتا ہے۔

ابتدا میں گھڑ دوڑ کے لئے وہ گھوڑے منتخب کئے جاتے تھے جن میں مسابقت اور رفتار دوسرے گھوڑوں سے زیادہ تھی۔ ان کو عام گھوڑوں سے الگ رکھا گیا یہاں تک کہ گھڑ سواری کے لئے گھوڑوں کی نسل عام گھوڑوں سے الگ ہوگئی۔

اسی طرح صحرائی پودے کیکٹس کو محفوظ ماحول میں رکھا جاتا ہے تو ان کے جین میں کانٹے پیدا کرنے کی خصوصیات مغلوب ہوجاتی ہے۔ نتیجے میں بغیر کانٹوں کی نسل پیدا ہوتی ہے۔

جین پر ماحول کی چھاپ پڑنے کی ایک مثال حضرت موسیٰؑ اور حضرت شعیبؑ کا واقعہ ہے۔

حضرت شعیبؑ کے ریوڑ میں سادہ اور بَری (نقش و نگار سے مزّین) بکریاں دونوں تھیں۔ طے پایا کہ سادہ بکریاں ان کی اور باقی حضرت موسیٰؑ کی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ بکریاں چراتے اور تالاب پر لے جاکر پانی پلاتے۔ رفتہ رفتہ بَری بکریاں بڑھتی گئیں اور سادہ بکریاں کم ہوگئیں۔ دراصل تالاب کے گرد درخت تھے جن کا عکس پانی پر پڑتا تھا۔ پانی پینے کے دوران عکس ذہن میں نقش ہوکر بکریوں کے جین کا حصہ بن گیا اور سادہ بکریوں سے نقش و نگار سے مزّین بکریاں پیدا ہوئیں۔

انسانی دنیا میں بھی ماحول کے تصورات بچے کی جین پر اثر انداز ہونے کی کئی مثالیں ہیں۔ کتاب "نظریۂ رنگ و نور" میں سے ایک مثال اختصار کے ساتھ درج ذیل ہے۔

" انگریز ماں کے جسم سے ایک بچہ ایسا تولد ہوا کہ جس کے نقش و نگار اور رنگ حبشی نژاد بچوں کی طرح تھے۔ موٹا ناک نقشہ، گھونگھریالے بال، سیاہ رنگ، چوڑا سینہ اور مضبوط اعصاب۔ باپ

نے تسلیم نہیں کیا کہ بچہ اس کا ہے۔ معاملہ بہت زیادہ الجھ گیا اور تحقیق و تفتیش انتہا کو پہنچی تو راز کھلا کہ ماں حمل کے زمانے میں جس کمرے میں رہتی تھی، وہاں دیوار پر حبشی بچے کا فوٹو آویزاں تھا۔ ماہرِ نفسیات، دانش وروں اور ڈاکٹروں کا بورڈ بیٹھا اور باہمی صلاح مشورے اور افہام و تفہیم سے یہ بات طے پائی کہ عورت حمل کے زمانے میں حبشی بچے سے فطری اور طبعی طور پر قریب، اور اسے بار بار دیکھتی رہی ہے۔ دیکھنے میں اتنی گہرائی پیدا ہوگئی کہ احساسات پیٹ میں موجود بچے کو منتقل ہوگئے۔ دوسری بار جب وہ امید سے ہوئی تو وہاں ایک خوب صورت بچے کا فوٹو آویزاں کیا گیا اور تجرباتی طور پر ماں کو ہدایت کی گئی کہ اس فوٹو کو زیادہ سے زیادہ دیکھا جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پیدا ہونے والے بچے کے نقوش تقریباً وہی تھے جو دیوار میں لگے ہوئے فوٹو کے تھے۔"

قدرت نے ہر مخلوق کے لئے مخصوص ماحولیاتی نظام بنایا ہے تاکہ معین مقداریں قائم رہیں۔ فرد چاہے آدمی ہو یا حیوان، دوسرا ماحول اختیار کرتا ہے تو لامحالہ ساخت اور ذہن پر اثر پڑتا ہے۔ تبدیلی پہلے نسمہ کی سطح پر عمل میں آتی ہے پھر جسم پر ظاہر ہوتی ہے۔ نسمہ مادی جسم سے نو(9) انچ کے فاصلے پر ہو بہو اس جیسا روشنیوں کا جسم ہے۔

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں:

"بچے کا آدھا شعور والدین سے بنتا ہے اور آدھا شعور ماحول سے بنتا ہے۔ نسمہ پہلے خیال قبول کرتا ہے۔ پھر یہ خیال جین تک پہنچتا ہے۔ اور یہی جین خلیے کو ہدایات دیتا ہے اور خیال کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے۔ پوری زندگی جین کی ان ہی ہدایات پر عمل درآمد ہوتا رہتا ہے۔"

یہ قانون بہت اہم ہے کہ ماحول کے اثرات جین میں ریکارڈ ہو کر بچے کا کردار بناتے ہیں اور عمل و کردار جین کا حصہ بننے سے نسلیں بدل جاتی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔" (الرعد:۱۱)

قدرت کا قانون ہے کہ انفرادی سطح پر ظاہری و باطنی ماحول اور کردار کی تبدیلی کے اثرات جب معاشرے کی جین کو منتقل ہوتے ہیں تو معاشرہ تبدیل ہوتا ہے۔

نظامِ الٰہی کے تحت ہر چیز اپنے ریکارڈ کے مطابق وقوع پذیر ہے۔ اس لئے ریکارڈ کے جس رخ کو غالب کیا جاتا ہے، اسی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور وہی آئندہ نسلوں کو منتقل ہوتا ہے۔

عرفانہ شہزاد

کس نے کہا اور کس نے سنا

اس مقام کی وسعت پر حیرت ہوئی۔ جتنے لوگ سما جائیں، تنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ لگتا ہے کہ زمین نے اس خطے پر اپنا باطنی رخ ظاہر کر دیا ہے۔ یہاں آنے والے اللہ کی محبت میں ڈوب جاتے ہیں۔ الحمدللہ اس صحت بخش فضا میں زندگی کے تمام وسائل موجود ہیں۔ میں نے یہاں برکت کا مشاہدہ کیا۔

رات کا آخری پہر اختتام پذیر تھا۔ میں نے ایک بار پھر پکارا، اے خانقاہ کی حسین رات!

قدرت مجھے فقیر کے در پر لائی ہے جو میرے حواس کو تیرے حواس سے ہم آغوش کر کے شعور کے لئے بند راستے کھولے گا اور میری ویران راتوں کو اللہ کی یاد سے آباد کر دے گا۔

یہ سن کر رات شبنم بنی اور شبنم ماحول کے پیراہن میں جذب ہو گئی۔

بھائی میرے ساتھ جاگ رہا تھا۔ رات نے اس پر کیا راز افشا کئے، میں نہیں جانتی البتہ خاموشی بتا رہی تھی کہ شب نے اسے بھی بیدار کیا ہے۔

صبح کی روشنی پھوٹتے ہی سورج کی کرنیں اس خطۂ زمین پر ایسے نچھاور ہوئیں جیسے ہر طرف سونا بکھر گیا ہو۔ رات کی چاندنی سنہری چادر میں تبدیل ہو گئی۔ کچھ دیر میں سنہری پردہ چاک ہوا تو ہنستے مسکراتے ہزار ہا رنگ پھولوں کے چہرے نمایاں ہو گئے۔ جابجا پھولوں سے بھرے ہوئے پودے تھے جیسے پھولوں کی ٹوکریاں نفاست سے رکھی ہوئی ہوں۔ فضا خوش بو سے مسحور تھی۔

فجر کی اذان ہوتے ہی میں نے وضو کر کے نماز پڑھی۔ راہ نما کی ہدایت کے مطابق نماز میں پڑھی جانے والی سورتوں کا ترجمہ پہلے سے یاد کر لیا تھا جس سے یکسوئی قائم ہوئی۔

نماز فجر کے بعد ایک بار پھر باغ میں آئی۔ مسحور کن فضا میں مخملی گھاس کے قالین پہ پیر رکھتے ہی محسوس ہوا کہ جسم لطیف ہو کر خود بہ خود آگے بڑھ رہا ہے یا زمین پیروں سے لپٹ کر مجھے دھکیل رہی ہے۔ ہر منظر اور احساس میں فطرت کے قوانین تھے۔ میرے چاروں طرف درخت، درختوں کے نیچے کیاریاں اور کیاریوں میں قسم قسم کے پھول تھے۔ بعض درختوں کی شاخیں پھلوں کی کثرت

سے جھکی ہوئی تھیں جب کہ ڈالیوں پر خوش رنگ پرندے صبح کا گیت گا رہے تھے۔

گھاس پر چیکو کا دانہ ملا جو پک کر درخت سے گرا تھا۔ اٹھا کر کھایا۔ مٹھاس سے بھرپور تھا۔ آگے بڑھی تو عنابی رنگ دانے فرش پر جابجا بکھرے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کون سا پھل تھا۔ چکھا تو نرم تھا اور مزے میں خوش ذائقہ —— ترش کی آمیزش بھی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ بادام کا درخت ہے۔ گٹھلی توڑنے سے سفید رنگ بادام نکلتا ہے جو ذائقے میں عام بادام سے مختلف اور نرم ہے۔

سیر کے دوران کبھی روپہلی دھوپ چھا جاتی، کبھی بادل سایہ بن کر گزرتے۔ ہواؤں میں مستی سے درختوں کی شاخیں دل نشین انداز میں ایسے جھک جاتیں جیسے آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہی ہوں۔ تتلیاں پھولوں کے ساتھ اٹھکھیلیوں میں مصروف تھیں۔ ہاتھ بڑھا کر ایک تتلی پکڑی۔ رنگین پروں کا ریشمی لمس محسوس کیا تو خدشہ ہوا کہ کہیں زخمی نہ ہو جائے، فوراً چھوڑ دی۔ وہ قریب پھول پر جا بیٹھی اور میں مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ لگتا تھا کہ پودے، درخت اور پھل یہاں کی مٹی میں نمو کے لئے بے تاب ہیں۔ اللہ والے جہاں ڈیرا ڈالتے ہیں، وہاں کی مٹی، فضا اور ان میں بسنے والی مخلوقات خوش بو محسوس کر لیتی ہیں۔

حضرت علامہ اقبالؒ کے اشعار ذہن میں آئے،

تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہی خلوت گزینوں میں

خانقاہ میں وسیع و عریض برآمدے کے ساتھ دو منزلہ خوب صورت عمارت ہے جس میں متعدد کمرے ہیں۔ ان کمروں میں دفاتر ہیں۔ کچھ کمرے علاج معالجے اور کچھ مطالعہ و تحقیق کے لئے مختص ہیں۔ میں اس عمارت کے سامنے سے ایسے گزری جیسے برسوں کا سفر لمحوں میں طے کیا ہو۔

عمارت کے ایک جانب خوب صورت چھت والے مستطیل کمرے کی اپنی روحانی اہمیت ہے۔ پتہ چلا کہ برسوں پہلے جب یہ جگہ جنگل تھی اور آس پاس آبادی کا نام و نشان نہیں تھا، تب اللہ کے دوست نے اس مقام پر جھونپڑی تعمیر کر کے خانقاہ کی بنیاد رکھی۔

اس مقام کی وسعت پر حیرت ہوئی۔ جتنے لوگ سما جائیں، تنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ لگتا ہے کہ زمین نے اس خطے پر اپنا باطنی رخ ظاہر کر دیا ہے۔ یہاں آنے والے خواتین و حضرات اللہ کی محبت میں ڈوب جاتے ہیں۔ الحمد للہ اس صحت بخش فضا میں زندگی کے تمام وسائل موجود ہیں۔ میں نے

یہاں برکت کا مشاہدہ کیا۔

دنیا میں جنت کی یادگاریں ہیں اور دوزخ کے طبقات کی نشانیاں بھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں زمین کی سیر کا حکم دیا ہے تاکہ ہم زمانے کے آثار و احوال سے سبق سیکھیں۔

”ان سے کہو ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔“

(الانعام: ١٠)

میں نے زندگی کا کچھ عرصہ سلطنتِ عمان میں گزارا ہے۔ وہاں قیام کے دوران تاریخی مقامات کی سیر کی۔ ان میں سے کئی جائے عبرت ہیں۔

عمان میں ایک علاقہ تنوف (کھنڈرات) ہے جو دو شہروں نزوا اور بہلا کے درمیان واقع ہے۔ تنوف تازہ پانی کے جھرنوں کے ساتھ کھنڈرات (اطلال تنوف) کے لئے بھی مشہور ہے۔ یہاں پر تباہی کے آثار اور ویرانی دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ البتہ آثار بتا رہے تھے کہ یہ عمارتیں اپنے زمانے میں طرزِ تعمیر کا عظیم شاہکار ہوں گی۔

یہاں شمالی مہرہ کے ریت کے تودوں میں، شہر ”ارم ذات العماد“ اور اس کے قرب و جوار کے علاقے دبے ہوئے ہیں۔ یہ حضرت ہودؑ کی قوم عاد تھی۔ قومِ عاد کو قومِ ارم بھی کہتے ہیں۔ وادیِ برہوت کا رتیلا میدان شمالی مہرہ سے ہوتا ہوا عمان سے جا ملتا ہے۔ تصور کیجئے کہ ریت کے اس وسیع و عریض سمندر میں قومِ عاد کا وہ شہر دبا ہوا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

”تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا، اونچے ستونوں والے عادِ ارم کے ساتھ۔ جن کی مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی۔“ (الفجر: ٦۔٨)

یہ جگہ اب وسیع و عریض صحرا ہے جسے احقاف کہتے ہیں۔ احقاف حقف کی جمع ہے۔ لغوی معنی ”ریت کے بلند و بالا ٹیلے“ کے ہیں۔ عبرت ناک مقام پر باریک ریت کے ہزاروں فٹ اونچے تہ بہ تہ پہاڑ ہیں۔ عذاب سے متاثر اس وادی میں کتنی وحشت ہے، اندازہ یہاں آکر ہی ہو سکتا ہے۔ اہلِ دنیا کے لئے یہ مقام نشانی ہے کہ جب قومیں نافرمان ہو جاتی ہیں تو ان کی تعمیر کردہ عظیم الشان عمارتیں ہی ان کا مدفن بن جاتی ہیں۔ بھیانک وادی کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کسی زمانے میں یہ دنیا کا سب سے زیادہ سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں پھلوں اور پھولوں کے وسیع باغات، ٹھنڈے پانی کے چشمے، آبشاریں اور بلند و بالا عمارتیں تھیں، مال دار، طاقت ور اور شان دار تمدن رکھنے والی قوم آباد تھی۔ ان کی معاشی حالت مستحکم تھی مگر جہالت، باطل اقوال، فاسد خیالات اور اعمالِ بد نے ان کو تباہ کر دیا اور وہ تا ابد

عبرت کا نمونہ بن گئیں۔

وادی کو دیکھتے ہی مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ زبان خاموش تھی مگر قلب کلمہ طیبہ کا ورد کر رہا تھا۔ احساس ہوا کہ جب پیغمبران کرام نے اپنی قوم کی تباہی دیکھی ہو گی تو کتنا درد محسوس کیا ہو گا۔ یہ سوچ کر دل بھر آیا۔

آج اللہ کے ایک دوست کی جائے مسکن کی سیر کے دوران کیسی کیسی لطیف کیفیات کا ادراک ہوا، ساتھ ہی صدیوں پرانے عبرت ناک مناظر یاد آگئے۔ دل اظہارِ تشکر کے جذبے سے بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک دوست سے ملایا اور ان پر اپنی بے پناہ رحمت کا مشاہدہ بھی کروایا۔

پھر دیگر مصروفیات میں دن گزر گیا۔

اگلی صبح نمازِ فجر کے بعد راہ نمانے اجتماعی طور پر یاحی یاقیوم کا ذکر کروایا۔ پھر مراقبہ ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے حاضرین سے مختصر خطاب فرمایا۔ میں نے جلدی سے پرس سے ڈائری اور قلم نکالا اور لکھنا شروع کیا۔ انہوں نے فرمایا:

"قانون یہ ہے کہ جس طرح حقیقت دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتی ہے اسی طرح فکشن حواس بھی دماغ کی اسکرین پر منتقل ہوتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ فکشن حواس کی منتقلی ہمیں پابند حواس میں قید رکھتی ہے اور غیر فکشن حواس کی منتقلی ہمیں آزاد دنیا سے روشناس کراتی ہے۔ روحانی سلاسل کے اسباق، قواعد و ضوابط، ذکر و فکر، اعمال و اشغال، تفکر، مراقبہ اور تصورِ شیخ ان کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ کسی ایک ہستی کو مرکزیت بنا کر بار بار دماغ کی اسکرین پر منتقل کیا جاتا ہے۔ جتنا زیادہ ایک خیال یا ایک مرکزیت دماغ کی اسکرین پر منعکس ہوتی ہے اسی مناسبت سے دماغ میں مخصوص پیٹرن بن جاتا ہے اور یہی پیٹرن تصوف کی اصطلاح میں طرز فکر ہے۔ ہم جب استاد، پیر و مرشد یا شیخ کا تصور کرتے ہیں تو ازلی قانون کے مطابق شیخ کے اندر کام کرنے والی روشنیاں ہمارے دماغ پر وارد ہوتی ہیں اور دماغ ان روشنیوں کو قبول کرتا ہے۔ اس جھدِ مسلسل سے مرکزیت کا حصول نسبت ہے۔ روحانیت میں نسبت حاصل کرنے کا اہم ذریعہ محبت و عشق کی لہریں ہیں۔ جس مناسبت سے لہریں دماغ میں جذب ہوتی ہیں اسی مناسبت سے ذہن منتقل ہوتا ہے۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ شیخ کے اندر کام کرنے والی روشنیاں سالک میں منتقل ہو جاتی ہیں۔"

خطاب میں بظاہر ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ مجھے رونا آئے لیکن آنسو مسلسل گر رہے تھے۔ خیال نے کہا کہ یہ نورانی الفاظ کی تاثیر ہے۔

جو کچھ فرمایا تھا، دن میں کئی بار پڑھا اور غور کیا۔ الفاظ کہہ رہے تھے کہ ہم جن باتوں، اشیا اور افراد میں دلچسپی لیتے ہیں، ان سے نسبت قائم ہو جاتی ہے اور غیر محسوس طریقے سے ان کی روشنیاں ہمیں منتقل ہوتی ہیں۔ ان الفاظ کی روشنی میں اپنی زندگی کا جائزہ لیا اور آئندہ زندگی کا لائحہ عمل طے کیا۔

تین دن گزر گئے۔ آج ہماری واپسی تھی۔ شعور اور لاشعور گلے مل رہے تھے۔ ایک طرف لگتا تھا یہاں برسوں گزار دیئے ہیں تو دوسری طرف محسوس ہوا کہ ابھی آئی تھی اور ابھی چل دی۔ دل اداس تھا مگر خوشی اس بات کی تھی کہ نسبت قائم ہوئی ہے۔ میں نے یہاں قیام کے دوران تین دن رات اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کیا اور روح کو سرشار پایا۔ راہ نمانے ہماری توجہ اس جانب مبذول کی کہ دنیا مسافر خانہ ہے۔ جس مقام پر رہو، اللہ کی یاد دل میں بسالو، دل آباد رہے گا۔

جانے سے پہلے ہماری ان سے ملاقات ہوئی۔ مہربان راہ نمانے ہم بھائی بہن کو زادِ راہ دیتے ہوئے فرمایا، کھاتے پیتے ہوئے جانا۔

پھر شفقت سے سر پر ہاتھ رکھ کر ہمیں دعائیں دیں اور فرمایا، سب کو میری طرف سے دعا اور سلام کہنا۔ (قسط: ۵)

نازک آبگینے

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں
حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی
مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں
کبھی اپنا نظارہ بھی کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں
مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں
مجھے روکے گا تو اے ناخدا کیا غرق ہونے سے
کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں
جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی ! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہی خلوت گزینوں میں
کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمن دل کو
کہ خورشید قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں
محبت کے لئے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں
سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل! حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں
نمایاں ہو کہ دکھلادے کبھی ان کو جمال اپنا
بہت مدت سے چرچے ہیں ترے باریک بینوں میں
خموش! اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

(شاعر مشرق حضرت علامہ اقبالؒ)

آسمانی دنیا

جب ہم آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو ہمیں بے شمار ستارے نظر آتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ستارے نظر آتے ہیں بلکہ ستاروں کی روشنی، ان کی ٹھنڈک، ان کی چمک اور اس ماحول کو جس میں ستارے جگ مگ کر رہے ہیں، حواس کو انہیں دیکھ کر سکون ملتا ہے۔ ستاروں کو دیکھتے ہیں تو یہ بات ہمارے لاشعور میں آجاتی ہے کہ ستارے کہیں قائم ہیں اور کسی بساط پر مخصوص نظام کے تحت گردش کررہے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ انسانی نگاہ اپنے ماحول کے باہر کی چیزوں کو دیکھ سکتی ہے اور دیکھنے کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر کام کرنے والی حس ان چیزوں کے تاثرات کو محسوس کرتی ہے۔

مثلاً جب ہم چاند کو دیکھتے ہیں تو ہمارا دماغ چاند کی ٹھنڈک کو محسوس کرتا ہے، جب ہم سورج کو دیکھتے ہیں تو ہمارا دماغ سورج کی تپش کو محسوس کرتا ہے۔ چاند کی روشنی اور سورج کی روشنی کو دیکھنا آنکھ کا دیکھنا ہے اور چاند و سورج کے تاثرات کو قبول کرنا حس کا پہچاننا ہے۔

چاند سورج کیا ہے؟ اس بارے میں ہمیں صرف اتنا علم ہے کہ یہ چاند ہے، یہ سورج ہے۔
آسان الفاظ میں اس طرح کہیں گے کہ انسان کی نگاہ تمام اجرامِ سماوی کو دیکھتی ہے اور زمین کے اوپر مختلف نوعوں اور مخلوقات کو بھی دیکھتی ہے۔ آنکھ جو نگاہ کا تصور دے رہی ہے، کائنات کو دیکھتی ہے۔

کائنات کا دیکھنا دو طرزوں میں ہے۔ ایک کائنات کو صرف دیکھنا۔ دوسری طرز یہ ہے کہ کائنات کی ماہیت سے واقف ہونا۔ کائنات کو دیکھنا یا مظاہر کو دیکھنا شعوری دائرہ کار میں آتا ہے۔ کائنات کے باطن کو دیکھنا یعنی کائنات کن فارمولوں پر قائم ہے، لاشعور میں دیکھنا ہے۔

* قارئین سوال کرسکتے ہیں۔ (ادارہ)

نفیسہ شاکر

آدمی خود نہیں دیکھتا ـــــ؟

پانی کے بارے میں ہماری رائے مشکوک ہے کیوں کہ ہم بیمار ہوں یا صحت مند، دونوں حالت میں زبان کے ذائقے کو پانی کا ذائقہ سمجھتے ہیں۔ ناقص شعور کا قانون یہ بنا کہ آدمی خود نہیں دیکھتا، شے کے دیکھنے کو دیکھتا ہے۔

کیا حمد و ثنا ہو اس صانع باکمال کی جس نے کائنات کو عجائبات سے سجا کر انسان کو زمین پر خلیفہ بنایا اور علم و معرفت کا تاج پہنایا۔ علم اور معرفت یک جان دو قالب ہیں اور باطن میں ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ علم ہو اور معرفت نہ ہو تو علم سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ علم وہ جو معرفت عطا کرے ورنہ سب لاعلمی ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ فرماتے ہیں:

"معرفت بے علم محال ہے اور علم بے معرفت وبال ہے۔" (کتاب: نفحات الانس)

علم جاننے کو کہتے ہیں اور معرفت پہچاننے کو۔ جب تک کسی کو پہلے سے نہ جانیں، پہچان نہیں سکتے۔ جیسے ہمارے سامنے بہت کچھ ہے لیکن کچھ نہیں ہے۔ کچھ نہ ہونے کو ہم نے خلا کا نام دیا ہے حالاں کہ خلا ایک آباد دنیا ہے۔ ہم نہیں جانتے اس لئے موجودگی سے یکسر انکار کر دیتے ہیں اور انکار کر کے خلا میں آباد دنیا تک پہنچنے کا راستہ اپنے لئے بند کر لیتے ہیں۔ خلا کے بارے میں ہم نے بہت سنا ہے اور اپنے تئیں خلا کو دیکھا بھی ہے مگر دیکھ لینا اور سن لینا کافی نہیں۔ جاننے کا مرحلہ معرفت کے درجے میں مکمل ہوتا ہے۔

علم کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ علمِ ظاہری ۲۔ علمِ حقیقی

قیاس اور محدود حواس سے حاصل شدہ علم رسمی ہے کہ اس کا مرکز ظاہری اشیا ہیں۔ نورِ قلب جس کو "فواد" کہتے ہیں، اس سے حاصل ہونے والا علم حقیقی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

" دل نے جو دیکھا، جھوٹ نہیں دیکھا۔"

(النجم:۱۱)

علمِ حقیقی کا مرکز صفات و ذاتِ الٰہی ہے۔ اس میں ظاہری عقل کو دخل نہیں، باطنی حس کو اولیت

ہے جو فرد کو خود سے واقف کرکے رب سے متعارف کرواتی ہے۔ قرآن کریم میں علمِ حقیقی کو علمِ لدنّی بھی کہا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”اور وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے علمِ لدنّی عطا کیا تھا۔“

(الکھف: ۶۵)

سورہ فاتحہ میں بندے کی تعریف ”ایاک نعبد و ایاک نستعین“ ہے۔

ترجمہ یہ ہے کہ ”اے اللہ! ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں“۔

اللہ تعالیٰ کے خالص بندے شیطان کے بہکاوے میں نہیں آتے، وہ جنت کے حواس میں رہتے ہیں۔ نافرمانی سے پہلے نوعِ آدم پر جنت کے حواس کا غلبہ تھا۔ ذہن جو سوچتا، وہ ہو جاتا۔ جنت میں نفس کے بجائے روح غالب ہے۔ وہاں شک کو دخل نہیں، زندگی یقین پر قائم ہے اور انسان ہر شے کو ”احسنِ تقویم“ کی فطرت کے مطابق دیکھتا ہے۔ احسنِ تقویم اپنے منصب ”فی الارض خلیفہ“ سے واقف ذہن ہے جسے اللہ نے تخلیقی فارمولوں کا علم عطا کیا ہے۔

احسنِ تقویم کا متضاد رخ اسفل سافلین ہے جس میں شک اور وسوسے کا غلبہ ہے۔ شک فہم کو ناقص اور مخلوق کو اللہ سے دور کر دیتا ہے۔

یہ جاننا کہ میں ہوں لیکن انجان رہنا کہ میں کیا ہوں، کس لئے اور کس کے لئے ہوں تو اپنے ہونے کا علم ادھورا یعنی ناقص ہے۔ ایسے فرد کا اپنے اور ماحول کے بارے میں شعور قیاس پر مبنی ہے۔

محدود ذہن کی صلاحیت کا یہ حال ہے کہ وہ خود کو نہیں دیکھ سکتا، آئینہ خدوخال کی خبر دیتا ہے، اور آئینہ بھی اس نے خود بنایا ہے۔ اپنی بنائی ہوئی چیز میں خود کو دیکھ کر تسلیم کرنا کہ یہ میں ہوں، علمِ حقیقی سے گریز ہے۔ جب حواس محدود اور محسوسات معین ہوں تو اس لکیر سے آگے جو کچھ ہے، لاعلمی کی نذر ہو جاتا ہے۔

ہم آئینے کے سامنے کھڑے ہیں، آئینے کے اندر خود کو دیکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آئینہ اگر نظر انداز کر دیں، ہم آئینے میں خود کو نہیں دیکھ سکتے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم آئینہ نہیں دیکھ رہے، آئینے کے دیکھنے کو دیکھ رہے ہیں؟

آنکھ ظاہری جسم دیکھتی ہے۔ جسم کی مشینری کیسے کام کرتی ہے، ایکسرے مشین کی مدد سے نظر آتا ہے، خود نہیں دیکھ سکتی۔ یہ رگ پٹھوں، خون، گوشت، دل، جگر، آنتیں، تلی، گردے اور اعضا کی اندرونی ساخت کی بات ہے جو ظاہر میں شمار ہوتے ہیں مگر کھال دیوار بن جانے سے فرد اس نظام کو نہیں دیکھتا۔ یہ سطریں پڑھ کر اپنے ہاتھ،

پیر اور جسم پر کھال کو تھوڑی دیر دیکھیں، نظر آئے گا کہ کھال نہیں، زندان کی دیواریں ہیں۔

زندگی کا تجزیہ بتاتا ہے کہ ہم کسی کو براہِ راست نہیں جانتے، دوسری چیز کی مدد سے تعارف رکھتے ہیں۔ بخار میں زبان میٹھے پانی کو کڑوا بتاتی ہے۔ باقی لوگوں کو معلوم ہے کہ پانی میں تبدیلی نہیں آئی، بخار کی وجہ سے ذائقے کی حس متاثر ہوئی ہے۔ پانی کو میٹھا سمجھنے والے بھی پانی کا علم نہیں رکھتے۔ ذائقے کی حس انہیں بتاتی ہے کہ پانی میٹھا ہے۔ اگر بخار ہو جائے تو پانی ان کو کڑوا لگے گا۔ بخار ایک وجود ہے، ہم وہ دیکھتے ہیں جو بخار دیکھتا ہے۔

براہِ راست جاننے کے بجائے زبان کے ذائقے کی مدد سے رائے قائم کی گئی ہے اس لئے میٹھے کو کڑوا اور کڑوے کو میٹھے کا نام دیا۔ لہٰذا پانی کے بارے میں ہماری رائے مشکوک ہے کیوں کہ ہم بیمار ہوں یا صحت مند، دونوں حالت میں زبان کے ذائقے کو پانی کا ذائقہ سمجھتے ہیں۔

ناقص شعور کا قانون یہ بنا کہ آدمی خود نہیں دیکھتا، شے کے دیکھنے کو دیکھتا ہے۔ بخار نے پانی کو کڑوا دیکھا اور آدمی نے بخار کے دیکھنے کو دیکھا۔ یہ اسفل سافلین کا شعور ہے۔

استاد نے شاگرد سے کہا، میرے کمرے میں جاؤ، وہاں طاق میں آئینہ رکھا ہے، وہ لے آؤ۔

شاگرد کو اکثر ایک شے دو نظر آتی تھیں۔

کمرے میں گیا تو مخمصے میں پڑ گیا کہ یہاں دو آئینے ہیں، کون سا اٹھاؤں؟

واپس جا کر پوچھا تو استاد نے کہا، اگر دو آئینے ہیں تو ایک توڑ دو، دوسرا لے آؤ۔

شاگرد کمرے میں گیا اور ایک آئینہ اٹھا کر فرش پر دے مارا۔ وہ چکنا چور ہو گیا۔ دوسرا آئینہ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ـــــ وہاں کچھ نہیں تھا۔

قارئین! بتایئے شاگرد نے ایک آئینے کو دو کیوں دیکھا؟ اور جب ایک ٹوٹ گیا تو ـــــ ؟

کسی امر کے سمجھنے اور یقین کرنے میں ناقص عقل استعمال کرنے سے حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی اور آدمی شے کا انکار کر دیتا ہے۔

گھڑی دیکھتے ہوئے ہم منٹ اور گھنٹے کی سوئیوں کو ساکن سمجھتے ہیں حالاں کہ وہ چل رہی ہیں۔

اسٹیشن پر ریل گاڑی میں بیٹھے ہوتے ہیں اور دوسری گاڑی گزرتی ہے تو گمان ہوتا ہے کہ جس گاڑی میں ہم بیٹھے ہیں، وہ چل رہی ہے۔ اور جب ریل گاڑی تیزی سے چلتی ہے تو اندر بیٹھے ہوئے مسافروں کو درخت اور سڑک کے کنارے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ریل ساکن معلوم ہوتی ہے۔ یہ اپنی سمجھ کے مطابق چیزوں کو دیکھنا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہم وہ نہیں دیکھتے جو ہے، اپنے ذہن کے دیکھنے کو دیکھتے ہیں۔

بسا اوقات کوئی واقعہ سن کر لوگ کہتے ہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ ایک طرح سے اشارہ ہے کہ ہم نے چیزوں سے متعلق حد قائم کر دی ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے جب کہ ایسا نہیں ہوتا؟ اور جب اس کے برخلاف ہوتا ہے تو تعجب کرتے ہیں کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے!

ہر شے اپنے اندر موجود عناصر کی تصویر ہے۔ اس لئے اندر سے بے خبر، باہر سے بھی بے خبر رہتا ہے۔ تربوز جتنا بڑا پھل ہے، اس کا بیج اتنا چھوٹا ہے۔ میز پر بیج اور تربوز ساتھ رکھیں اور ان میں تعلق تلاش کریں۔ قدرت راہ نمائی کرتی ہے کہ بیج غبارہ ہے جو پھول کر وزنی تربوز بن گیا۔ تربوز میں سے ہوا نکال لیں، جسامت بیج کے برابر رہ جائے گی یعنی تربوز بیج میں ہوا بھرنے کا مظاہرہ ہے۔ بیج سخت ہے جب کہ بیج سے بننے والا گودا نرم ہے۔

کوئی چیز ایک حالت میں سخت اور دوسری حالت میں نرم ہو تو اس کے بارے میں ایک رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ تربوز اپنے بیج میں چھپے ہوئے رنگوں اور مقداروں کی تصویر ہے۔

محسوسات میں ایک حس مشترک ہے جو واہمہ کو دماغ پر وارد کرتی ہے پھر خیال تک پہنچاتی ہے، خیال میں تخیل کا رنگ بھر کر تصور کو رنگین کرتی ہے اور رنگینی کو مظہر بنا دیتی ہے۔ واہمہ، خیال، تصور اور مظاہرہ محض اطلاع کے نزول کے مختلف نام ہیں، ان کے تحت مظہر بننے والی اطلاع ایک ہے۔ خدوخال میں گہرائی کو ہر مرحلے پر الگ نام دینا محدود ذہن کی نشانی ہے۔

درحقیقت اطلاع شعور کی آسانی کے لئے مختلف درجوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ دیکھنے والے نے محدود ذہن کے دیکھنے کو دیکھا جو اسے ایک ہی تصویر ٹکڑوں میں دکھا رہا ہے۔ یہ طرزِ نگاہ ذہن کو تقسیم کر کے حقیقت او جھل کر دیتی ہے۔

حقیقی علم کا تقاضا کیا ہے—؟

اطلاع کے مراحل میں ربط تلاش کیا جائے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ جب لاشعور سے آنے والی انفارمیشن (اطلاع) ایک ہے پھر آخری درجے میں مظہر کیوں بنتی ہے، واہمہ کے درجے میں نظر کیوں نہیں آتی؟

خلاصہ: فکشن ذہن کو میڈیم بنا کر دیکھنے سے حاصل ہونے والا تعارف فکشن ہے۔

براہِ راست دیکھنا یہ ہے کہ اپنے اور اس شے کے درمیان ربط تلاش کریں تا کہ شے کو شے کی نظر سے دیکھنے کی اہلیت بیدار ہو۔ اس مرحلے سے علمِ حقیقی کی ابتدا ہوتی ہے۔

صبا محمود

یا اللہ! تیرا شکر ہے

ابا جی نے کہا تھا کہ زندگی اللہ سے ربط کا نام ہے اس لئے زندگی سے مایوس مت ہونا۔ ابا جی ہفتے دو ہفتے میں ایک بار کسی اسپتال کا چکر لگاتے اور ہمیں ساتھ لے جاتے تھے تاکہ بچوں کو احساس ہو کہ پیسہ ناقابلِ اعتبار اور صحت قابلِ قدر ہے۔

گاڑی موٹر وے سے گزر رہی تھی۔ نصیر اور شاکر کاروبار کے سلسلے میں اسلام آباد سے لاہور جارہے تھے۔ دونوں اچھے دوست تھے۔ آدھا سفر باتوں میں گزر گیا۔ تقریباً ہر موضوع پر گفت و شنید کے بعد جنت دوزخ کا ذکر آیا۔

نصیر مالی حالات کی وجہ سے پریشان تھا — گاڑی کی رفتار بڑھادی تھی۔

شاکر نے قریب سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے کہا، دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور جنت دوزخ اس کے پھل ہیں۔ اچھا عمل جنت اور برا عمل دوزخ کے مترادف ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو اس دنیا میں بھی لوگ جنت اور دوزخ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

یہ بات غور سے سنو! بڑے بوڑھے بتاتے ہیں کہ ماں نے کھانا پکانے کے لئے بیٹے کو ماچس لانے بھیجا۔ وہ بازار گیا تو دکانیں بند تھیں۔ گھر واپس آکر ماں سے کہا، دکانیں بند ہیں، ماچس نہیں ملی۔ ماں نے غصے میں کہا، ماچس نہیں ہے تو چولہا کیسے جلے گا؟ جا، جاکر دوزخ سے لے کر آ!

ماں کو غصے میں دیکھ کر بیٹا تیزی سے باہر بھاگا اور گلی کے نکڑ پر پہنچ کر پڑوسی سے ٹکرا گیا۔ پڑوسی نے پوچھا، کہاں دوڑے جارہے ہو، کس بات کی جلدی ہے؟ بتایا کہ کھانا پکانے کے لئے آگ جلانی ہے، دکانیں بند ہیں، اماں کہتی ہیں کہ دوزخ سے لے آ۔ پڑوسی بولا، بیٹا! دوزخ میں آگ کہاں! جو وہاں جاتا ہے، اپنے حصے کی آگ ساتھ لے جاتا ہے۔

یہ سن کر نصیر نے غیر سنجیدگی سے کہا، تمہاری نظر میں دوزخ آگ کے بغیر جل رہی ہے، پھر جنت مری کے پہاڑوں جیسی ہوگی۔

نصیر! ذہنی تناؤ اور بیماریاں سب آگ ہیں جو آدمی کو اندر ہی اندر جلاتی ہیں۔ میں تمہیں مری لے کر جاؤں تو پہاڑوں کی خوب صورتی سراہنے

کے بجائے اپنی پریشانی کو پہاڑ سے تشبیہ دوگے۔ ہمارا ڈرائیور اپنے دو کمروں کے گھر کو جنت کہتا ہے۔ میرے لئے بھی اپنا گھر، خوش مزاج بیوی، شرارتی بچے اور اچھے دوستوں کی رفاقت جنت سے کم نہیں۔ جنت خوشی کا نام ہے، خوش رہنے والے کے لئے ہر مقام فردوسِ بریں ہے۔

نصیر کا ذہن کاروباری تھا۔ تقریباً تین سال سے مسلسل مالی نقصان کی وجہ سے ہاتھ تنگ ہو گیا تھا۔ شاکر کی بات کا اثر نہیں ہوا۔ کہا، یہ دنیا ہے بھولے بادشاہ! ہر طرف پریشانیاں اور بیماریاں ہیں۔ کبھی بچہ بیمار تو کبھی بچے کی اماں۔ نیند کی گولی کھائے بغیر رات نہیں گزرتی۔ فون بجتا ہے تو دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے کہ پھر نقصان کی خبر ہوگی۔ دن رات محنت کر کے بھی زندگی میں سکون نہ ہو تو ایسی محنت کا کیا فائدہ!

نصیر نے رش کی وجہ سے گاڑی کی رفتار اچانک کم کی تو شاکر کو جھٹکا لگا۔ ہاتھ ڈیش بورڈ پر رکھ کر خود کو سنبھالتے ہوئے بولا، شکر کرو محنت کی کمائی کھاتے ہو، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ پیسہ سب کچھ ہوتا تو تم پیسے سے خوشیاں اور صحت خرید لیتے۔ نقصان کیا ہوا کہ محنت سے گھبرا گئے۔ ایسی کون سی مخلوق ہے جو محنت نہیں کرتی؟ سب اپنے حصے کا کام کرتے ہیں اور یہی کائنات کی خوب صورتی ہے۔

نصیر طنز سے بولا، بھرے ہوئے پیٹ کی میٹھی میٹھی باتیں! تم نے پریشانی دیکھی کہاں ہے، جدّی پشتی امیر ہو، زندگی میں سکھ اور چین ہے۔ یہاں تو کبھی اماں بیمار ہیں کبھی بچہ۔ اسکول کی فیسوں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ اوپر سے بلوں کی بھرمار سے زندگی اجیرن ہے۔

شاکر بولا، افسانوی باتیں نہیں کر رہا، خوش رہنے اور شکر کی اہمیت بتا رہا ہوں۔ کاروبار میں نقصان ہو رہا ہے تو اس سے پہلے منافع بھی ہوا، وہ بھول گئے۔ میرا بھی نقصان ہوتا ہے لیکن میں خود پر حاوی نہیں کرتا۔ شکر ادا کرتا ہوں کہ صحت اچھی ہے اور بچے سلامت ہیں۔ شکر سے رزق میں برکت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وسائل مقناطیس کی طرح میرے گرد گھومتے ہیں۔ میں جدّی پشتی امیر ہوں تو کیا تمہارے ابا نے کم دولت چھوڑی ہے؟ 45 سالوں میں کبھی بھوکے نہیں سوئے، مقروض نہیں ہو، بہنوں کی شادی کر کے ذمہ داری پوری کی، بچے اچھے اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ نقصان کیا ہوا، تم تو ساری نعمتیں بھول گئے؟ اتنی دولت ہو کر اندیشوں میں رہنا ناشکری ہے۔ گھر میں پریشانی اور کاروبار میں نقصان کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ تم لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔

وہ زچ ہو کر بولا، کس بات پر شکر ادا کروں؟ بچوں کے بیمار رہنے پر؟ اپنے نقصان پر؟

شاکر بولا، اندھے بہرے نہیں ہو، اس پر شکر ادا کرو۔ دماغ مفلوج نہیں ہے، اس پر شکر ادا کرو۔ خدانخواستہ موذی مرض نہیں ہے، اس پر شکر ادا کرو۔ شکر کے لئے نعمتیں بہت ہیں لیکن تم نے صرف پیسے کو نعمت سمجھ لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

"اور یاد رکھو! تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا سخت ہے۔" (ابراھیم : ۷)

ابا جی نے کہا تھا کہ زندگی اللہ سے ربط کا نام ہے اس لئے زندگی سے مایوس مت ہونا۔ ابا جی ہفتے دو ہفتے میں ایک بار کسی اسپتال کا چکر لگاتے اور ہمیں ساتھ لے جاتے تھے تاکہ بچوں کو احساس ہو کہ دولت ناقابل اعتبار، اور صحت قابلِ قدر ہے۔ وہ مریضوں کی مالی اعانت، لڑکیوں کی شادی اور مکان بنانے کے لئے مدد میں پیش پیش رہتے اور یہ سب خاموشی سے کرتے تھے۔ ان کی تربیت ہمارے ذہن میں نقش ہوگئی۔ جو ابا جی نے ہمارے لئے کیا، وہ ہم بہن بھائی اپنے بچوں کے لئے کرتے ہیں۔ دولت اچھی چیز ہے مگر آنی جانی ہے۔ سچ ہے کہ ماں باپ کا اولاد کے لئے اصل اثاثہ تربیت ہے جو کبھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔

گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ شاکر نے اشارے سے رفتار کم کرنے کو کہا۔

نصیر بولا! تمہارے حالات مجھ سے مختلف ہیں۔ تم لاپروا شخص ہو۔ مجھ پر ذمہ داریاں ہیں، مسلسل نقصان سے اعصاب بوجھل ہو گئے ہیں۔

شاکر نے لاپروائی کا خطاب ملنے پر قہقہہ لگایا اور کہا، بات ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھاگئی۔

پھر زوردار دھماکا ہوا۔ گاڑی تیز رفتاری کی وجہ سے موڑ پر بے قابو ہوگئی تھی۔

آنکھوں کے سامنے اندھیرا اور کانوں میں شور کی آوازیں تھیں۔ پھر آوازیں آنا بند ہوگئیں۔

مادی حواس معطل ہوتے ہی نصیر کی باطنی آنکھ کھلی ۔ اس نے خود کو ماضی میں سفر کرتے ہوئے دیکھا۔ کتابِ زیست کے اوراق تیزی سے پلٹ رہے تھے اور بچپن سے لے کر حادثے کے مقام تک مناظر فلم بن گئے۔

خود کو بہن کے ساتھ گاؤں کی حویلی کے باغ میں رنگ برنگی تتلیاں پکڑتے ہوئے دیکھا۔ کوئی تتلی ہاتھ نہ آئی تو منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔ دادی اماں نے آواز دی، بیٹا! تتلیوں کو اڑنے دو، ان کے اڑنے سے باغ میں رونق ہے۔ پھر اسکول سے کالج اور کالج سے عملی زندگی کا سفر۔ والد کا کاروبار سنبھالا۔

گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ اگلے منظر سے ذہن بوجھل ہوگیا جب دکھایا گیا کہ اس نے پریشانیوں کو اہمیت دی اور نعمتوں پر شکر ادا نہیں کیا۔ناشکری کی لہریں گھر سے لے کر دفتر تک پھیل گئیں اور وسائل سمٹنے لگے۔ گھر میں بیماریوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور برکت اٹھنے سے کاروبار میں نقصان ہوا۔ اپنی فلم دیکھ کر وہ اذیت میں تھا۔ اللہ سے دعا کی کہ مجھے ایک اور موقع عطا فرمائیں۔

اسپتال میں بستر کے قریب بیٹھے بیٹے نے باپ کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھے تو شور مچادیا کہ ابا ہوش میں آرہے ہیں۔بیوی نے فوراً نرس کو آواز دی۔ نصیر کو شاکر کا خیال آیا اور افسوس ہوا کہ میری وجہ سے وہ بھی حادثے کا شکار ہوگیا۔وہ اسی اسپتال کے دوسرے کمرے میں تھا۔ زخم گہرے تھے لیکن اللہ نے کرم کیا اور جان بچ گئی۔

نصیر اسپتال سے گھر آنے کے بعد نقاہت کی وجہ سے کئی روز دفتر نہیں گیا۔ ذہن میں گزشتہ زندگی کی فلم چلنے لگتی اور دماغ سن ہوجاتا۔ اگر حادثے میں موت واقع ہوجاتی تو گناہوں کی تلافی کیسے ہوتی۔ اللہ کا شکر ادا کیا جس نے زندگی عطا کر کے نقصان کی تلافی کا موقع دیا۔

حادثے کے تین مہینے بعد وہ دفتر میں بیٹھا فائلوں کی ورق گردانی کررہا تھا۔ڈرائیور چاچا منظور کمرے میں داخل ہوئے اور لفافہ دیتے ہوئے بولے،صاحب! اگلے ہفتے بیٹی کی شادی ہے، دعوت نامہ اور ساتھ میں چھٹی کی درخواست ہے۔

درخواست پر دستخط کر کے چھٹی منظور کی۔

چاچا منظور نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا، شادی میں ضرور آیئے گا،خوشی ہوگی۔

نصیر نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

وہ دروازے تک پہنچے تھے کہ پیچھے سے آواز دی، چاچا! تمہاری کتنی بیٹیاں ہیں؟

صاحب! تین بیٹیاں ہیں ماشاءاللہ ۔ بڑی بیٹی اپنے گھر کی ہوچکی ہے، یہ منجھلی ہے۔ اللہ نے چاہا تو اگلے سال چھوٹی بیٹی کی بھی شادی کردوں گا۔

انشاء اللہ! بچیاں اپنے گھر میں خوش رہیں تو ماں باپ سکون کی نیند سوتے ہیں۔ یہ کہہ کر دراز میں سے چیک بک نکالی اور رقم لکھ کر چیک ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، میری طرف سے بیٹی کے لئے تحفہ ہے۔

چاچا منظور نے چیک پر دو لاکھ کی رقم لکھی ہوئی دیکھی تو آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولے، صاحب! مشکل وقت میں آپ کی طرف سے مدد ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔

چاچا! آپ برسوں سے ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ میرا فرض تھا۔ بارات میں کتنے مہمان ہیں؟

چاچا منظور نے بتایا، تقریباً تین سو۔

ٹھیک ہے۔ بارات کے کھانے کا انتظام دفتر کی طرف سے ہو گا۔

چاچا منظور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہم و گمان میں نہیں تھا کہ دفتر کی جانب سے بیٹی کی شادی کے اخراجات میں تعاون ہو گا۔ انہوں نے اوپر دیکھا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

نصیر دفتر سے روانہ ہوا۔ دل انجانی خوشی سے سرشار تھا۔ کاروبار کی پریشانی اور آنے والے کل کے اندیشے ختم ہو گئے تھے اور وجود نے سکون کی چادر اوڑھ لی تھی۔

گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فون ملایا۔

دوسری طرف شاکر تھا۔

شاکر! میں بہت خوش ہوں۔ اللہ کا شکر ہے۔

وہ بولا، تمہاری آواز بتا رہی ہے۔ لگتا ہے کاروبار میں منافع ہوا ہے۔

نصیر نے ہنستے ہوئے کہا، کاروبار میں منافع نہیں ہوا لیکن زندگی سود و زیاں سے آزاد ہو گئی ہے۔ منوں بوجھ تھا مجھ پر جس سے میں ایک لمحے میں آزاد ہو گیا۔ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ میری پریشانیوں کی وجہ ناشکری ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں ناشکری سے دور ہو گیا۔ فون اس لئے کیا ہے کہ رات کا کھانا تمہاری پسند کے ریستوران میں ساتھ کھائیں گے۔

شاکر نے چھیڑتے ہوئے کہا، وہ تو ٹھیک ہے لیکن گاڑی میں چلاؤں گا۔

دونوں طرف سے قہقہہ بلند ہوا۔

نصیر نے ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے اللہ کا شکر ادا کیا۔ بیوی بچوں کو بے ہوشی کے دوران خود پر گزرنے والی کیفیات بتائیں اور کہا، آدمی دنیا میں جو عمل کرتا ہے، وہ ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس ریکارڈ کو کتاب المرقوم کہا ہے۔ مرنے کے بعد آدمی کو فلم دکھائی جاتی ہے۔ میں نے ناشکری کی فلم دیکھی اور اذیت سے دوچار ہوا۔ اللہ نے مجھ پر رحم کیا اور زندگی دی تاکہ میں بقیہ عمر شکر ادا کر کے گزاروں اور لوگوں کی خدمت کروں۔ زندگی فلم کی طرح ریکارڈ ہو رہی ہے۔ تم بھی اذیت سے بچنا چاہتے ہو تو شکر کو شعار بنا لو۔

تین مہینوں میں صرف ایک تبدیلی سے نصیر کی زندگی بدل گئی۔ اس نے نعمتوں کی قدر کرنا اور شکر ادا کرنا سیکھ لیا تھا۔ شکر سے خوشی کی لہریں اس پر محیط ہو گئیں اور دنیا جنت نظیر بن گئی۔

اس نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے آسمان کی طرف نگاہ کی اور کہا، یا اللہ! تیرا شکر ہے۔

سرورق کی تشریح

اکتوبر 2020ء کے ”ماہنامہ قلندر شعور“ کا سرورق دیکھتے ہی مجھے نظر آیا کہ

”ہر ذرّے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی تخلیق ظاہر ہورہی ہے۔ درخت، سبزہ، پھل، پھول، بلی، چڑیا سب ذرّات سے مل کر بنے ہیں۔ ذرّات کو روح جوڑ کر رکھتی ہے ورنہ یہ بکھر جائیں گے اور مٹی، مٹی میں مل جائے گی۔ روح نکلتی ہے تو ذرّات بکھر جاتے ہیں اور ان ذرّات سے نئی نئی چیزیں بنتی ہیں۔“

(شگفتہ زبیر، جماعت ششم، عظمیٰ پبلک ہائر سیکنڈری اسکول، کراچی)

روح اور جسم کا رشتہ منقطع ہوتے ہی روح کے لباس (جسم) کا وجود برقرار نہیں رہتا۔ وہ بالآخر گل سڑ کر مٹی میں مل جاتا ہے۔ موت واقع ہونے کے 24 سے 72 گھنٹے تک اندرونی اعضا کے گلنے سڑنے کا عمل شروع ہوتا ہے اور چند گھنٹوں میں جسم کا درجہ، حرارت ماحول کے درجہ، حرارت تک آجاتا ہے۔ جسم کا جو حصہ زمین سے مَس ہوتا ہے، گردش رکنے سے خون وہاں جمع ہونے لگتا ہے۔ نظامِ انہضام کے بیکٹیریا اور دیگر جراثیم آنتیں تحلیل کرنا شروع کرتے ہیں۔ جگر، لبلبہ اور پِتّے کی رطوبات ان کو گلا کر ختم کر دیتی ہیں۔ اعضا کی تحلیل سے انتہائی بدبودار گیسیں پیدا ہوتی ہیں اور تیسرے دن سے پانچویں دن تک جسم غبارے کی طرح پھول جاتا ہے۔ گیسوں کے دباؤ کی وجہ سے خون (جو سیاہ رنگ اختیار کر چکا ہے) جھاگ کی صورت میں ناک اور منہ سے باہر آتا ہے۔ جِلد مرنے کے بعد قدرے نیلی، نیلے سے گہرے جامنی پھر سیاہی مائل ہو جاتی ہے۔ آٹھویں سے دسویں دن تک کیڑے مکوڑے اور جراثیم معدہ اور باقی اعضا کو تحلیل کرتے ہیں۔ دو تین ہفتوں تک بال، دانت اور ناخن الگ ہو جاتے ہیں۔ ایک مہینے کے بعد گوشت پوست سیال حالت اختیار کر کے گہرے سیاہ بدبودار مائع کی شکل میں زمین میں جذب ہونے لگتا ہے اور کچھ حصہ گیس بن کر خارج ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ڈھانچا باقی رہ جاتا ہے۔ یہ موت کے بعد کھلی فضا میں لاش کا احوال ہے۔

زمین کے اندر کفن میں لپیٹ کر دفن کیا جائے تو مذکورہ عمل قدرے سست ہو سکتا ہے۔ اگر تدفین کے مقام پر مٹی میں تیزابی خواص ہیں تو بکھرنے کا عمل بہت تیزی سے انجام پاتا ہے۔ تیزابی زمین میں تھوڑے عرصے بعد ہڈیوں کا نام و نشان باقی نہیں رہتا، وہ بھی ذرات میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ البتہ معتدل یا اساسی خاصیت رکھنے والی زمین میں ہڈیاں صدیوں تک محفوظ رہ سکتی ہیں۔

محققین کا اندازہ ہے کہ کھلی فضا میں گلنے سڑنے کا عمل پانی میں ڈوبے جسم سے دو گنا اور مٹی میں دفن جسم (بشرطیکہ مٹی تیزابی نہ ہو) سے آٹھ گنا تیزی سے انجام پاتا ہے۔ جو بھی صورت حال ہو آخر کار جسم ابتدائی عناصر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

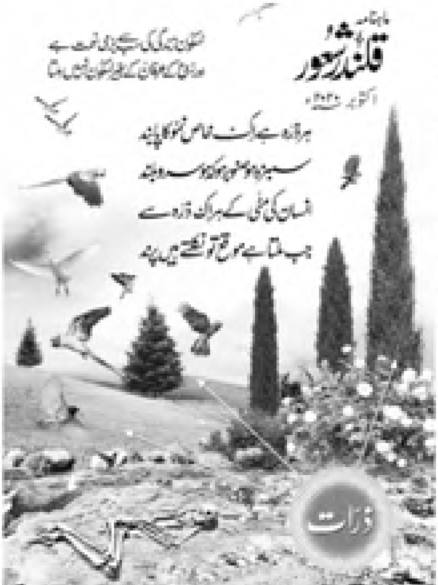

چرند، پرند اور تمام اشیا تھوڑے بہت فرق کے ساتھ انہی مراحل سے گزر کر ذرات میں تبدیل ہوتی ہیں۔

اب ذرات سے نیا لباس بننے کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ ری سائیکلنگ کی اصطلاح جسے موجودہ دور کی تحقیق و تلاش سے جوڑا جاتا ہے، دراصل ایسا عمل ہے جو قدرت زمین پر ابتدا سے دہرا رہی ہے۔ وہ زمینیں جو کسی زمانے میں قبرستان تھیں، صدیوں بعد وہاں صرف مٹی رہ جاتی ہے۔ نیا دور شروع ہوتا ہے، خالی بستیاں آباد ہوتی ہیں، باغات لگتے ہیں، مالی آتا ہے، بیج بوتا ہے، اناج اور پھل ظاہر ہوتے ہیں جن کو پرندے، آدمی اور حیوانات کھاتے ہیں۔ اس خوراک سے افزائش نسل ہوتی ہے اور نیا دور اختتامی مراحل کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔ ذرات دراز قد سرو (درخت) بھی بن سکتے ہیں اور سایہ دار صنوبر بھی۔ رنگ برنگ پھولوں یا سرسبز گھاس کی شکل اختیار کر سکتے ہیں یا غذا کی صورت میں خون میں شامل ہو کر نسل کی افزائش کا ذریعہ بھی۔

غرض مٹی کے ذرات میں کسی بھی مخلوق کی مقداریں موجود ہیں۔ جو فرد آج زمین پر موجود ہے، وہ ذرات کی یکجائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مٹی میں مخفی مقداروں کا علم ان ہستیوں کو عطا کیا ہے جن کو قرآن

کریم میں اولی الالباب کہا گیا ہے۔ اولی الالباب گروہ میں ایک نمایاں نام ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ نے ذرّات کے نظام کو اپنی رباعیات میں خوب صورت اور لطیف پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔

ہر ذرہ ہے اک خاص نمو کا پابند　　سبزہ ہو کہ صنوبر ہو کہ ہو سرو بلند
انسان کی مٹی کے ہر اک ذرّہ سے　　جب ملتا ہے موقع تو نکلتے ہیں پرند

خانوادہ سلسلہ عظیمیہ ــــ عظیمی صاحب فرماتے ہیں:

"تمام جان دار مٹی سے بنے ہیں۔ مٹی سے مراد روشنیوں کا وہ خلط ملط ہے جس میں تمام رنگ موجود ہیں۔ اسے کل رنگ روشنی بھی کہا جاتا ہے۔ یہی رنگ درخت کی جڑیں زمین سے حاصل کرتی ہیں اور یہی رنگ تنا، شاخوں، پتّوں، پھول اور پھل میں نمایاں ہو جاتے ہیں لیکن تخلیق کی یہ طرز دیرپا نہیں۔ جلد ہی تخلیق پھر مٹی بن جاتی ہے۔ پرندے بھی اسی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔"

(ح۔ا۔پ)

شعور مٹی کو سطحی طور پر دیکھتا ہے جب کہ لاشعور مٹی کے باطن سے واقف ہے۔ مٹی کے اندر تخلیقی عوامل مختلف ڈائیوں میں ڈھلنے سے رنگوں سے مزین تخلیقات ظاہر ہوتی ہیں۔ اکتوبر 2020ء کے سرورق پر ابدالِ حق کی رباعی سے ذہن میں تخلیقی فارمولے اور جسم کی بے ثباتی کا خیال آیا۔ ہر ذرّہ یا جسم مخصوص عمر اور جسامت میں زندگی گزارنے کے بعد مٹی میں مل جاتا ہے۔ زندگی درحقیقت ہر لمحہ تغیر سے گزر کر غیب ظاہر غیب کی مساوات پوری کر رہی ہے۔

مٹی میں ثقل اور چپک ہے۔ شعور مسلسل تکرار کرتا ہے کہ جو نظر آتا ہے وہی سب کچھ ہے۔ اگر ذہن پرواز کر کے لاشعوری حواس کو چھو لے تو شے (ذرّات) کی حقیقت سے باخبر ہو جاتا ہے۔ شعور کے لئے اسکرین زمین ہے، وہ مظاہرہ بھی یہیں دیکھتا ہے۔ جب کہ لاشعور، جہاں سے فلم چل رہی ہے، وہاں کی دنیا دیکھتا ہے اور بندہ ان روشنیوں سے واقف ہو جاتا ہے جن سے زمین پر رنگوں کا امتزاج ہے۔ سرورق پر لفظ ذرّات دیکھ کر ذہن میں دائرہ آیا۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ دائرے میں بند ہے۔ مظاہرہ یا مادی وجود دراصل شے کا ٹھہراؤ ہے جو ثقل کی وجہ سے مثلث بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں مثلث ہے، وہاں رنگ غالب ہوتے ہیں۔

(ڈاکٹر زبیر احمد۔ کراچی)

حماد علی شاہ

یارب! مرے خامہ کو زباں دے
منقار ہزار داستاں دے

بادشاہوں اور نوابوں کا تو ذکر ہی کیا، عوام کا یہ حال تھا کہ دس بیس دوست رات کو کسی جگہ جمع ہوئے، کوئی گنّا چھیل رہا ہے، کوئی شیرینی لئے بیٹھا ہے، ایک طرف انگیٹھی پر چائے پک رہی ہے اور داستان گو اس طرح شیریں زبانی میں مصروف ہے.....

چڑیا لائی دال کا دانہ، چڑا لایا چاول کا دانہ۔ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔ یا پھر وہ چڑیا جس نے اپنے پڑوسی کوّے کو بھائی بنایا اور مدد کی۔ کوّے کا گھر نمک سے بنا تھا، ضرورت پڑنے پر چڑیا کو نمک نہیں دیا — رات بارش میں نمکین گھر بہہ گیا۔ اس قسم کی چھوٹی بڑی کہانیاں ہم نے بچپن میں بصد شوق سنی ہیں۔ یہ تخیل کو رنگین بناتی تھیں اور ہم چڑے چڑیا، دیو اور پریوں کی دنیا میں کھو جاتے تھے۔ بچپن میں لایعنی کہانی بھی لطف دیتی تھی، تخیل کی دنیا آباد کرکے انجان دنیا کی سیر کرواتی تھی جس کو ہم نے بہت عرصے تک حقیقی سمجھا۔ یہ درست ہے کہ بعض کہانیاں حقیقی نہیں ہوتیں مگر ہر کہانی میں زمانے کا رنگ ہوتا ہے۔

جب سے آدمی نے ٹولیوں میں رہنا شروع کیا اور خیال کے اظہار کے لئے الفاظ کا سہارا لیا، اس وقت سے کہانیاں وجود میں آئیں۔ وقت کے ساتھ چھوٹی کہانیاں بڑی ہو کر داستان بن گئیں۔

داستان میں دلکشی ہے اور حیرت بھی۔ اجنبی فضا، فوق الفطرت کردار، حسن و عشق، عیاری اور ان سب سے بڑھ کر داستان کہنے کا طریقہ جو سننے والوں کو طلسماتی دنیا میں لے جاتا ہے۔

داستانیں فطری طور پر ہر دور کے تمدن کا حصہ رہی ہیں۔ عرب کے زمانۂ جاہلیت میں رات کھانے کے بعد لوگ کھلے مقام پر بیٹھ جاتے اور داستان گو فصاحت و بلاغت سے شب کو پُراسرار بنا دیتا۔ ایک حصہ ختم ہونے پر اگلی شب تک کے لئے محفل برخاست ہوتی اور وہ کھجوریں بطور اجرت لے کر گھر روانہ ہو جاتا۔ انگلستان اور فرانس کی داستانوں کا خاص موضوع بادشاہ اور سورما تھے۔ ایران میں امیر حمزہ اور ان کے رفقا داستان کے ہیرو تھے۔ ہندوستان میں راجا رسالو کی شجاعت کے قصے صدیوں دہرائے گئے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ایرانی داستان گوئی کا رواج ہوا۔ مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر داستان گوئی کی ابتدا طوطیِ ہند حضرت امیر خسروؒ نے کی۔ اس کے بعد کی معلومات میں اختلاف ہے۔ بعض کا کہنا ہے کہ امیر خسروؒ نے شہنشاہ اکبر کے دربار میں فارسی میں داستانِ امیر حمزہ کہی اور یہ کہ اردو میں اس داستان کا بنیادی تصور فارسی سے لیا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ علیل تھے تو امیر خسروؒ نے انہیں "قصہ چہار درویش" سنائی تھی۔

داستان گوئی کو باقاعدہ فن کی حیثیت شاہی درباروں سے ملی جہاں داستان گو بھاری تنخواہوں پر ملازم رکھے گئے۔ یہ پورے ہندوستان میں پھیل گئے تھے تاہم آخر کے مغل بادشاہوں کے زمانے میں تقریباً سب نے دلّی کو مرکز بنالیا کہ یہاں بادشاہ اور امرا آباد تھے اور دولت کی فراوانی تھی۔ اہلِ فن یہاں آکر مالامال ہو جاتے۔

پھر جب دلّی میں خزاں آئی تو سب نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ شاہانِ اودھ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دلّی کے نقشے لکھنؤ میں جم گئے۔ بادشاہوں اور نوابوں کا تو ذکر ہی کیا، عوام کا یہ حال تھا کہ دس بیس دوست رات کو کسی جگہ جمع ہوئے، کوئی گنّا چھیل رہا ہے، کوئی شیرینی لئے بیٹھا ہے، ایک طرف انگیٹھی پر چائے پک رہی ہے اور داستان گو اس طرح شیریں زبانی میں مصروف ہے،

"مخمور پر ایک تومار پڑی ہے اور دوسرے یاد اپنے گل عذار کی دل سے لگی ہے۔ بے تاب اور بے قرار، مثل عندلیبِ زار، بالِ شوق کھولے، نالہ و شیون کرتی چمنستان میں آئی اور چبوترہ بلّوریں پر جو باغ کے وسط میں بنا تھا، فرش مکلف بچھا، وہاں آکر بیٹھی کہ اضطراب کو قرار آئے۔ لیکن سیر گلزار نے آتشِ عشق بڑھائی۔ وہ گلبدن بے کلی سے گھبرائی جب یاد قامتِ یار آئی، صورت سرو دکھائی دی۔ چشمِ نرگس کو دیدۂ حیراں سمجھی۔ زلفِ سنبل کو گیسوئے پریشاں سمجھی۔ نخل عَلمِ ماتم نظر آیا۔ گل کو اپنے جگر سے مشابہ پایا۔ وہاں سے اٹھی اور بارہ دری میں آکر پلنگ پر گری۔ دنیا کی خبر نہ رہی۔"

حاضرین واہ واہ، سبحان اللہ کہتے جاتے۔ کمالِ فن یہ تھا کہ جب تک داستان ختم نہ ہو، سننے والے تخیلاتی فضا میں سانس لیتے رہیں۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کہتے ہیں:

"داستان طرازی من جملہ فنون سخن ہے۔ سچ ہے کہ دل بہلانے کے لئے اچھا فن ہے۔"

داستان گوئی نے مشغلے سے فن کی حیثیت حاصل کی تو چند اصول و قواعد مرتب ہوئے۔

۱۔ داستان طویل اور دلکش ہو مگر تکرار نہ ہو اور سننے والے مدت دراز تک انجام کے مشتاق رہیں۔

۲۔ اخلاق سے عاری اور نفرت انگیز نہ ہو۔

۳۔ زبان و بیان کی خوبیوں سے آراستہ ہو۔

۴۔ واقعات میں نقل پر اصل کا گمان ہو۔

داستان گو ان اصولوں سے واقف تھے اور ان کی پابندی کرتے تھے البتہ زیادہ توجہ زورِ بیان پر ہوتی تھی کہ حاضرین کو گہرائی میں جانے کا موقع نہ ملے۔ وہ لب و لہجہ، اتار چڑھاؤ، حرکات و سکنات اور موقع محل کی مناسبت سے طرز بیان اختیار کرتے اور کرداروں کی تصویر بن جاتے۔ اس طرح لوگوں کو ڈرامے کا بھی لطف آتا اور سماعت و بصارت بیانیے کے ساتھ سفر کرتی۔

داستان خالصتاً ''کہنے کا فن'' ہے تاہم بعد میں یہ لکھی جانے لگی۔ ان محفلوں میں بیٹھنے والے کہتے ہیں کہ جو لطف سننے میں آتا ہے، پڑھنے میں نہیں آتا۔ سننے میں واقعات پر غور و خوض کرنے کا اتنا موقع نہیں ملتا، آدمی تخیل کی وادیوں میں سفر کرتا ہے، پُراسرار گھاٹیوں اور نوک دار چٹانوں سے گزرتا ہے، حسن و کشش کی دنیا دیکھتا ہے، ٹھنڈے میٹھے چشموں سے پانی پیتا ہے، جھرنوں کی آوازیں سنتا ہے، سبزہ زار کی ٹھنڈی گھاس پر چلتا ہے، پریوں جیسی حسین دوشیزہ سے ملاقات ہوتی ہے، قریب جانے پر وہ غائب ہو جاتی ہے پھر کسی نئے دیس میں روپ بدل کر سامنے آتی ہے۔

اگرچہ داستان پڑھنے میں بھی تخیل کا عمل دخل ہے مگر اس میں تجزیاتی شعور کام کرنے لگتا ہے، واقعات عقل کی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں لہٰذا پڑھنے میں وہ لطف نہیں جو سننے میں ہے۔

''داستانِ امیر حمزہ'' سب سے معروف ہے۔ اس کی ایک کڑی ''طلسم ہوش ربا'' کی سات ضخیم جلدیں ہیں۔ دلّی کے آخری داستان گو، میر باقر علی سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے ''داستانِ امیر حمزہ'' پڑھی ہے؟ کہا، صرف ایک مرتبہ پوری پڑھ سکا۔

نثر کے علاوہ منظوم داستانوں کا بھی شمار نہیں۔ ان کو مثنوی کہتے ہیں۔ اردو ادب میں دو مثنویاں ''گلزار نسیم'' اور ''سحر البیان'' کو بہت پذیرائی ملی۔ ''گلزار نسیم'' کی کہانی قصہ گل بکاؤلی کے نام سے مشہور ہے۔ اصل قصہ عزت اللہ بنگالی کا لکھا ہوا فارسی نثر میں ہے جو 1722ء میں تصنیف کیا گیا۔ دیا شنکر نسیم نے اس کو اردو میں نظم کیا اور مثنوی کی ابتدا حمد باری تعالیٰ اور نعت سے کی۔

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر
حمدِ حق و مدحتِ پیمبرؐ
یارب! مرے خامہ کو زباں دے
منقار ہزار داستاں دے

اس کے بعد وہ کہتا ہے —

روداد زمانِ پاستانی — یوں نقل ہے خامے کی زبانی
پورب میں ایک تھا شہنشاہ — سلطاں زین الملوک، ذی جاہ
لشکر کش و تاجدار تھا وہ — دشمن کش و شہریار تھا وہ
خالق نے دیے تھے چار فرزند — دانا، عاقل، ذکی، خِردمند
نقشا ایک اور نے جمایا — پس ماندہ کا پیش خیمہ آیا
امید کے نخل نے دیا بار — خورشید حمل ہوا نمودار
وہ نور کہ صدقے مہرِ انور — وہ رخ کہ نہ ٹھہرے آنکھ جس پر
نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو — چشمک تھی نصیب اس پدر کو
خوش ہوتے ہی طفل مہ جبیں سے — ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اسی کو — پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو
نظروں سے گرا وہ طفل ابتر — مانند سرِ شکِ دیدۂ تر
پردے سے نہ دایہ نے نکالا — پتلی سا نگاہ رکھ کر پالا
تھا افسر خسرواں وہ گلفام — پالا تاج الملوک رکھ نام
جب نامِ خدا جواں ہوا وہ — مانندِ نظر رواں ہوا وہ
آتا تھا شکار گاہ سے شاہ — نظارہ کیا پدر نے ناگاہ
صاد آنکھوں کے دیکھ کر پسر کی — بینائی کے چہرے پر نظر کی
مہرِ لبِ شہ ہوئی خموشی — کی نورِ بصر سے چشم پوشی
دی آنکھ جو شہ نے رونمائی — چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی
ہر چند کہ بادشہ نے ٹالا — اس ماہ کو شہر سے نکالا
گھر گھر یہی ذکر تھا، یہی شور — خارج ہوا نور دیدۂ کور
آیا کوئی لے کے نسخۂ نور — لایا کوئی جا کے سرمۂ طور
تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور — بینا نہ ہوا وہ دیدۂ کور
ہوتا ہے وہی، خدا جو چاہے — مختار ہے، جس طرح نباہے

ادبی تخلیق اپنے مادی اور سماجی پس منظر سے زیادہ دور نہیں جاتی۔ داستان پڑھ کر بتایا جاسکتا ہے کہ اس کی ابتدا کس ملک، سماج اور زمانے سے ہوئی جیسے طوطا کہانی، گل بکاؤلی، مدھو مالتی، کام روپ، قطب مشتری وغیرہ ایسے قصے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان سے ہیں۔

لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد کی تفصیلات ظاہر کرتی ہیں کہ ان کا تعلق ہندوستان سے نہیں۔ "داستانِ امیر حمزہ" کے مختلف سلسلے جیسے "نوشیرواں نامہ"، "ہرمز نامہ"، "طلسم ہوش ربا" وغیرہ ایرانی معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں بیان کی گئی سماجی زندگی میں ہندوستانی روایات کا اثر ہے۔

مثنوی "سحر البیان" کے چند مصرعے پڑھیے جن میں بادشاہ کی حشمت وجاہ، مال ومتاع اور رعایا کی خوش حالی کا بیان ہے۔

رعیت تھی آسودہ و بے خطر
نہ غم مفلسی کا نہ چوری کا ڈر
سدا عیش و عشرت سدا راگ رنگ
نہ تھا زیست سے اپنی کوئی بھی تنگ
نہ دیکھا کسی نے کوئی واں فقیر
ہوئے اس کی دولت سے گھر گھر امیر

داستان گوئی میں ہر رنگ کے مضمون کو سو رنگ سے باندھا جاتا ہے۔ اس میں تفنن و ظرافت کی چاشنی ہے، حسن و عشق کا ذکر ہے، طلسماتی دنیا کا نقشہ ہے، فریب اور عیاری بھی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اگر عیاری اور فریب کا ذکر نہ ہو تو داستان کی طوالت اجیرن ہو جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ داستان گوئی میں منشی محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر نے لکھنؤ میں، اور میر کاظم علی اور میر باقر علی نے دلّی میں بہت نام کمایا۔ میر کاظم کے والد شاہی داستان گو تھے جب کہ بھانجے میر باقر علی ان کے شاگرد ہونے کے ساتھ اس فن کے آخری باکمال تھے۔ ان کے بعد دلّی میں داستان گوئی کا چراغ گُل ہو گیا۔

میر باقر علی دلّی کی پرانی تہذیب کے پرستار اور وضع دار آدمی تھے۔ جس موضوع پر بات کرتے، الفاظ اور معلومات کا ذخیرہ کم نہ ہوتا۔

دلّی کی عید کا منظر بیان کرتے ہیں:

"رات دو بجے سے قلعہ میں دھوم شروع ہوئی۔ صبح کا ہونا، زہرہ کا جھلکنا، ستاروں کا ڈبکنا، مشرق کی طرف عمودِ سحر کی نمود، شبنم سے بیٹھا ہوا گرد و غبار، دھلا دھلا آسمان اور وہ ہوا پر اڑتی اڑتی سی نوبت کی دھن، شہنائی کی آوازیں، باجوں کا شور، گھڑیالوں کی گج، دیوان خاص کے آگے نمگیرے کا ہوا سے جھومنا، بچھیرا پلٹن کا آنا، اگری پلٹن کا گزرنا.......... اس سردار کے پیچھے ایک رسالہ جن کے گھوڑوں کی یک رنگ چوکڑیاں۔ ان پر

سوارانِ جرّار، نیزے ہاتھوں میں لئے، سنانیں چمکتی، بیرقیں دو رنگی، ہوا سے لہراتی، ان کے عقب میں چوب دار، پیادے، چکردار پگڑیاں جن پر سنہری لیس ٹکی ہوئی، گلوں میں سرخ باناتی دگلی۔ برَ کے پاجامے سفید، پاؤں میں زرد جوتا، عصا چاندی کے جن پر سنہری آڑی بیل بنی ہوئی۔ اب شاہزادوں کی نالکیاں پالکیاں، بوجہ، ہوادار اور تن جام آنے شروع ہوئے۔ نقار خانے سے نوبت چھڑ رہی ہے۔"

" خلیل میاں فاختہ " بھی میر باقر کی داستانوں میں سے ہے۔ ابتدائی چند سطروں میں خلیل میاں کا نقشہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

" خلیل خاں پنشن خوار، عمر 82 سال، لمبا قد، گندمی رنگ، کتابی نقشہ، چہرہ پر جھریاں، ناک کی نوک پر منقیٰ کے رنگ کا لیکن منقیٰ سے بڑا جھرّیدار مسّہ، کسی قدر ہونٹ کی طرف جھکا گویا ہونٹوں سے دو دو باتیں کرنا چاہتا ہے اور مسّے کی نوک پر دو موٹے موٹے بال، ایک سفید دوسرا کالا بھورا، بل دار۔ منہ میں صرف دو دانت ہیں، سامنے کے چار دانتوں میں سے ایک دانت نیچے کا اور اوپر کی طرف کی کچلی جو مسوڑھے گلنے کی وجہ سے جڑ تک کھل گئی ہے اور میل سے سبز اور زرد سیاہی لئے ہوئے دکھائی دیتی ہے...... آنکھیں اندر دھنس گئی ہیں، بھویں جھک آئی ہیں اور چند بال موٹے پیدا ہو کر پلکوں سے ہم چشمی کا دعویٰ کر رہے ہیں۔"

میر باقر دلّی میں دس پندرہ روپے پر داستان کہتے تھے اور باہر جاتے تو سینکڑوں کی خبر لاتے۔ داستان سناتے ہوئے بصد شوق چائے نوش فرماتے تھے۔ کہتے تھے کہ چائے کی تین خوبیاں ہیں ۔لب سوز، لب بند اور لب ریز۔ پھر وضاحت کرتے کہ بہت گرم ہو، بہت میٹھی ہو اور بہت ساری ہو۔

داستانوں میں لوگوں کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تو میر باقر علی اخبارات میں مضامین لکھنے لگے۔ ان کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی دلّی میں داستان گوئی کا فن بھی خاموش ہو گیا۔

بیسویں صدی کے معروف ڈراما نویس جارج برنارڈ شاہ کا تعلق آئرلینڈ سے ہے ۔ ایک بار انہیں کسی اسٹیج ڈرامے کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ انہوں نے دعوت قبول کی۔ ڈراما دیکھنے کے دوران انہیں نیند آگئی۔
آخر میں حاضرین کی تالیاں بجنے پر آنکھ کھلی۔ میزبان ڈراما نویس ان کے پاس آیا اور خفگی سے کہا، اپنی کاوش کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کا متمنی تھا لیکن آپ سارا وقت سوتے رہے۔
جارج برنارڈ شاہ نے جواب دیا، سونا بھی ایک طرح کی رائے ہی ہے۔

فرزانہ پرویز

صلاحیت علم ہے

تقلید کے لئے رول ماڈل کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمر اور وقت کے ساتھ رول ماڈل تبدیل ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے بچپن سے ایسا ماحول میسر آجائے جس میں پیغمبرانہ طرز فکر غالب ہو، پھر بچے کا رول ماڈل تبدیل نہیں ہوتا کیوں کہ تمام انبیائے کرام کی طرز فکر حقیقت پر قائم اور ایک ہے۔

احسن الخالقین اللہ نے ہر مخلوق کو صلاحیتوں سے نوازا ہے — مخلوق ان صلاحیتوں کی امین ہے۔ سننا دیکھنا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، سوچنا سمجھنا، پڑھنا لکھنا، نقشے بنانا اور احساس اظہار سب صلاحیتیں ہیں جن کے معطل ہونے سے فرد مفلوج ہو جاتا ہے۔ شاعر اور مصنف پر ایسا وقت بھی آتا ہے جب ہفتوں آمد نہیں ہوتی اور وہ خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں۔ انجینئر کے ذہن میں نقشہ نہ بنے تو وہ انجینئر نہیں۔ ہاتھ پیروں میں خون کی گردش رکنے سے فالج، اور سوچنے سمجھنے کی حس سلب ہونے سے ذہن مفلوج ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیات متوجہ کرتی ہیں کہ مخلوق کو کائنات میں اپنا کردار ادا کرنے کے لئے صلاحیتیں بطور امانت دی گئی ہیں، وہ ان کی مالک نہیں، امین ہے۔

صلاحیت پر عمل کرنے کے قواعد و ضوابط اور اصول و قوانین ہوتے ہیں جن کو مجموعی طور پر اقدار کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً کمر جھکا کر چلنے اور بیٹھنے سے جسمانی ساخت متاثر ہوتی ہے اور ایک وقت کے بعد کمر سیدھی نہیں ہوتی، اس طرح متناسب اور خوب صورت جسم کی قدریں متاثر ہو جاتی ہیں۔

صلاحیت مغلوب ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔

۱۔ ان کو نظر انداز کرنا

۲۔ ان کا غلط استعمال

۳۔ امتحان یا آزمائش مقصود ہو

اللہ تعالیٰ نے نوعِ آدم کو احسنِ تقویم بنا کر کائنات کے ہر گوشے تک رسائی دی ہے اور اس کے مطابق صفات عطا کی ہیں۔ جن خواتین و حضرات نے اپنے منصب کو نظر انداز کیا، وہ بظاہر صحت مند کیوں نہ ہوں، کائنات میں سفر کرنے سے معذور اور نظامِ کائنات سے واقف ہونے کے لئے فکری طور پر مفلوج ہیں۔

تعلیم ایسا عمل ہے جو صلاحیت کو نمایاں کرکے فرد کی پہچان بناتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر فراز، پروفیسر ماجدہ، انجینئر رمیز، بیرسٹر عنبر، صنعت کار عمیر۔ یہ فرضی نام ہیں، سمجھانے کے لئے کہ تعلیم نے اہلیت کو نام سے منسوب کرکے پہچان بنادی۔

ہم رجحان کے مطابق شعبہ منتخب کرتے ہیں اور مقرر وقت کے بعد ڈگری ملتی ہے۔ دورانِ تعلیم اخلاقی اوصاف بیدار ہوئے یا نہیں، یہ استاد و شاگرد اور والدین پر منحصر ہے۔ ڈگری کی اہمیت بھی تب ہے جب تفکر کے روزن کھلیں یعنی تعلیم وہ جو سوچنا سکھائے، اعتماد، اعلیٰ کردار اور تحقیق و تفکر سے تخلیقی صلاحیت پروان چڑھائے۔

علم سے ممکنات کی دنیا تخلیق اور روشن ہوتی ہے۔ نئے تقاضے، رجحانات اور وسائل پیدا ہوتے ہیں اور آج میں رہتے ہوئے کل کو دیکھنے کی اہلیت بیدار ہوتی ہے۔ بیداری کو تفکر سے نسبت ہے۔ تفکر خلیے چارج کرکے ذہانت میں اضافہ کرتا ہے۔

حدیث مبارک ہے،

"مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

کائنات کی تخلیق نور سے ہوئی ہے۔ نور کی صفت یہ ہے کہ وہ ہر سمت میں ایک ہے۔ اس کا شرق اور غرب نہیں ــــــ ہر مقام نور علیٰ نور ہے۔ نور کے زون میں حواس کی رفتار ناقابلِ بیان ہے، نیز انفرادیت مغلوب اور اجتماعی شعور غالب ہوتا ہے۔ نور کی دنیا اور نورانی حواس کی معرفت انبیائے کرام کی تعلیمات پر عمل کرنے سے ملتی ہے اور یہی مخلوقات میں نوعِ آدم کا امتیاز ہے۔ اگر آدمی اپنے اندر محفوظ صلاحیت سے غافل ہے تو اس کا درجہ حیوانات سے پست ہے۔

تقلید کے لئے رول ماڈل کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمر اور وقت کے ساتھ رول ماڈل تبدیل ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے بچپن سے ایسا ماحول میسر آجائے جس میں پیغمبرانہ طرز فکر غالب ہو، پھر بچے کا رول ماڈل تبدیل نہیں ہوتا کیوں کہ تمام انبیائے کرام کی طرز فکر حقیقت پر قائم اور ایک ہے۔ سب نے اللہ پر یقین، شک سے دوری، علم و عمل، تفکر اور کردار سازی کو اہمیت دی ہے اور ان قدروں کو اخلاقِ حسنہ فرمایا ہے۔

صلاحیت کا تعلق اصول اور قدروں سے ہے لہٰذا رول ماڈل کی ضرورت کے بعد اقدار کی آبیاری کا دوسرا قدم انصاف کا نظام اور قانون کا احترام ہے۔ قانون کی پاسداری سے نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے اور اخلاقی قدریں استوار ہوتی ہیں۔ اس کے متضاد لاقانونیت معاشرے کو ہجوم میں تبدیل کرکے غیر اخلاقی قدروں کو فروغ دیتی ہے۔

کوئی علم اور شعبہ بد اخلاقی نہیں سکھاتا، قاعدے

اور ضابطے میں رہ کر طریقِ کار پر عمل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ علمِ ریاضی کہتا ہے کہ دو اور دو چار ہیں ــــ قاعدہ بن گیا کہ دو اور دو پانچ نہیں ہوتے۔ حلوہ کو ہلوہ لکھنا ضابطے کے خلاف ہے۔ مذکر کی پہچان کے لئے حروف مونث سے الگ ہیں۔ ہر شعبہ، علم اور زبان کے قوانین اس کی اخلاقیات ہیں اور علم تہذیب اور اصول کے دائرے میں رہنا سکھاتا ہے۔ 16 سال تعلیم حاصل کرکے ڈگری مل جائے لیکن اخلاقی قدریں بیدار نہ ہوں تو تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ ایسا فرد اپنے ہنر یا علم کے اصولوں سے واقف نہیں اس لئے زندگی میں کسی نہ کسی مرحلے پر بے حسی کا مظاہرہ کرتا ہے، اس کی ایجاد یا کسی قدم سے معاشرے کو نقصان پہنچتا ہے کیوں کہ جو علم اس نے حاصل کیا ہے، وہ اس کے احترام سے ناواقف ہے۔

خالقِ کائنات کا ارشاد ہے:

”وہی تو ہے جس نے امیوں میں، ایک رسولؐ خود ان ہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔“ (الجمعۃ: ۲)

فرمانِ الٰہی میں استاد اور علم کی اہمیت ، اور ظاہری و باطنی علوم کے شعبے بیان ہوئے ہیں۔

سب کا مقصد سیرتِ طیبہ پر عمل کرکے اخلاقِ حسنہ کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ اخلاق احسن ہونے سے چیزوں کو قبول کرنے کی وسعت بڑھتی ہے اور رموز سمجھ میں آتے ہیں۔

آیئے! ماضی میں سفر کرتے ہیں۔

یہ 14 سو سال قبل کا مدینہ منورہ ہے۔ اللہ کے محبوب، خاتم النبیین حضرت محمدؐ کی رحمت و برکت سے دورِ جہالت ختم ہو گیا ہے اور اسلامی، اخلاقی، علمی اور ہر لحاظ سے مثالی معاشرہ اور ریاست قائم ہو چکی ہے۔ حضور پاکؐ کی تعلیم سے لوگوں میں اعتماد، اعلیٰ کردار اور تحقیق و تفکر کی روشنی غالب ہو گئی ہے۔ مدینہ منورہ میں دور دراز سے لوگ تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں اور واپس جا کر علم کی روشنی پھیلاتے ہیں۔

رحمۃ للعالمین حضرت محمدؐ نے انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کیا۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

”انصاف کا دوسرا نام میزان یا توازن ہے۔ فضائے آسمانی میں ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑے کُرات تیزی سے گھوم رہے ہیں اور یہ حیرت انگیز نظام میزان یعنی توازن پر قائم ہے۔ زمین پر اقوام کا سلسلہ حیات بھی عدل و توازن کے بل پر قائم ہے اور اُن اقوام کا رہنا محال ہے جو انصاف سے عاری ہوں۔ ہمارے اسلاف زندگی

کے راز سے آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حالتِ جنگ میں بھی انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔"

خاتم النبیین حضرت محمدؐ نے لوگوں کی تربیت فرمائی اور اس کے لئے خود کو مثال بنا کر پیش کیا۔ جس ہستی کو دشمن بھی صادق وامین کہے اور امانتیں ان کے پاس رکھوائے، ایسے اعلیٰ کردار کی کیا تعریف بیان ہو۔ رب العالمین اللہ نے فرمایا ہے:

"درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یومِ آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔" (الاحزاب:۲۱)

دنیا میں جتنی ترقی ہوئی ہے، غور وفکر اور تخیل کا مظاہرہ ہے۔ جن چیزوں کو ہم انہونی سمجھتے تھے اور وہ باتیں جو کتابوں اور فلموں تک محدود تھیں، ان میں سے کئی آج روزمرہ زندگی میں شامل ہیں جیسے ریموٹ کے ذریعے برقی آلات کو کنٹرول کرنا، اسمارٹ فون، میلوں میل رابطہ اور گھر بیٹھے دور دراز مقامات کی سیر وغیرہ۔

آدمی دو رخ اور ہزاروں احساسات و جذبات کا مجموعہ ہے۔ سب کا تعلق خیالات سے ہے۔ اعتماد، اخلاق اور معرفت کے لئے خیالات میں پاکیزگی ضروری ہے۔ جسم کی صفائی نہ کی جائے تو تعفن اور سڑاند سے سابقہ پڑتا ہے۔ دوسری طرف نفرت، عداوت، حسد، کینہ، جھوٹ، چغلی، عیب جوئی، طعنہ زنی، حقارت اور تضحیک سے دور رہنا باطنی پاکیزگی کے لئے ضروری ہے۔ منفی اعمال اور صفائی نہ ہونا فساد کا سبب بنتے ہیں۔ فساد کے معنی ہیں کہ اللہ نے جس فطرت پر تخلیق کیا ہے، اس میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔

اللہ تعالیٰ کریم و رحیم اور حسین وجمیل ہیں۔ اللہ کو خوب صورتی، نفاست، ترتیب اور اخلاقِ حسنہ پسند ہے، مفسدین (فساد کرنے والے) کو سخت ناپسند فرماتے ہیں کیوں کہ فساد سے جسمانی اور روحانی صلاحیتیں پردے میں چلی جاتی ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ شریف کی تعمیر کے دوران اللہ تعالیٰ سے دعا کی،

"اور اے رب! ان میں خود ان کی قوم سے ایک رسولؐ بھیج جو انہیں تیری آیات سنائے۔ ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔"

(البقرۃ:۱۲۹)

تزکیہ کرنے والا فرد سلیم الفطرت اصحاب کے گروہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ سچ بولتا ہے۔ سچائی اعتماد پیدا کر کے خوف دور کرتی ہے اور اندر دیکھنے کی صلاحیت کو جِلا بخشتی ہے۔ کتاب و حکمت کی تعلیم کے ساتھ محاسبے کے لئے تزکیہ یعنی اندر کی

آواز کو سننے کی ضرورت ہے تاکہ طرز فکر درست ہو۔ علم و دانش کے دروازے بھی اندر کی آواز سننے سے کھلتے ہیں۔ تزکیہ وہ اوزار ہے جو دل کی مٹی کی گوڈی کرتا ہے، زائد اشیا (وسوسے) نکال کر زمین صاف کرتا ہے اور یقین کا بیج بوتا ہے۔ پانی دینے سے کونپل پھوٹتی ہے اور خیال رکھنے سے پودا قد آور درخت بن جاتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے ؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لئے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں۔" (ابرٰھیم: ۲۴۔۲۵)

حاصل تحریر یہ ہے کہ ہر صلاحیت علم ہے اور علم کے حصول کے اصول ہیں۔ اصولوں کا احترام کرنے سے ہم لامحالہ تہذیب کے دائرے میں آجاتے ہیں اور اخلاقیات کے مطابق صلاحیت یا علم سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمیں جاننا چاہیئے کہ ہماری تخلیق کا مقصد کیا ہے اور جتنی مخلوقات ہیں، ان میں ہمارا کیا مقام ہے؟ اس مقام کے تقاضے اور اصول کیا ہیں؟ تاکہ ہم اپنے اوصاف سے واقف ہوں اور ذہنی و فکری معذوری سے نجات حاصل کرکے اپنی تخلیق کا مقصد پورا کریں۔

ہر آن اللہ تعالیٰ کی نئی شان ہے۔ قدرت روزمرہ معاملات میں ہمیں ایسے مشاہدے کرواتی ہے جس پر اگر ہم غور کریں تو یقین کی دنیا روشن ہو جائے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات پر تفکر عادت بن جائے تو ہر لمحہ مشاہدہ ہے۔

ہر شے کسی شے کی مثل ہے

بادشاہ کے قریبی ساتھی کو شاہی معلم سے عداوت تھی۔ بادشاہ سے کہا کہ شاہی معلم استعاروں میں باتیں کرتے ہیں۔ یہی ان کی قابلیت ہے۔ استعاروں میں بات کرنے سے روک دیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ وہ کتنے باصلاحیت ہیں۔

بادشاہ نے ہامی بھر لی اور اگلے روز شاہی معلم سے کہا، آئندہ استعاروں کے بجائے عام فہم لفظوں میں بات کریں۔

شاہی معلم نے کہا، بادشاہ سلامت! یہاں ہر شے کسی شے کی مثل ہے۔ فرض کیجیئے بچے نے غلیل نہیں دیکھی۔ وہ پوچھے کہ غلیل کیسی ہوتی ہے اور میں جواب دوں کہ غلیل بس غلیل ہوتی ہے، کیا بات سمجھ میں آجائے گی؟ بادشاہ نے تسلیم کیا، نہیں! اور اگر بتایا جائے کہ غلیل کمان کی طرح ہے اور بانس سے بنائی جاتی ہے، کیا وضاحت نہیں ہوگی؟ بادشاہ نے تائید کی۔

شاہی معلم نے کہا، حضور! سمجھانے کے لئے دو باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مخاطب کیا جانتا ہے اور کیا نہیں جانتا۔ اگر آپ استعاروں میں بات کرنے کی اجازت نہیں دیں گے تو علم کیسے منتقل ہوگا—؟

عظیمی

چاند کی کرنوں سے ___
گھنے اور لمبے بالوں کی نشو ونما

45 سال سے خواتین کا پسندیدہ

روغن گلوسبز

کراچی: 021-36039157
حیدرآباد: 0222781798
میرپورخاص: 03133508543
ڈگری: 03453700144
ملتان: 03006338192

فیصل آباد: 041-8540132
لاہور: 03224112737
راولپنڈی: 051-5169242
اٹک: 03135168800
ہری پور: 03135914147

پشاور: 03219110156
مانسہرہ: 03005621447
مظفرآباد: 05822446661
میرپور: 03455701558

سیدنوشاد کاظمی
(افسانہ)

دس ہزار برس پرانی ڈائری

گزشتہ قسط کا خلاصہ: پروفیسر عثمان کی حویلی بستی والوں کے لئے پُراسرار ہے۔ انہوں نے قدیم دور کی معدوم زبان سیکھ کر ماضی سے پردہ اٹھانے کے لئے شہر سے دور پُرسکون بستی میں سکونت اختیار کی۔ تحقیق میں خلل کی وجہ سے وہ لوگوں سے نہیں ملتے، صرف ہیڈماسٹر ریاض بخش کو حویلی میں آنے کی اجازت تھی۔ پروفیسر عثمان کو دس ہزار برس قبل کے ایک ادیب کی ڈائری ملی۔ انہوں نے زبان سیکھ کر ڈائری پڑھی تو معلوم ہوا کہ ہر دور ماضی کی تصویر ہے۔ تحقیق مکمل ہوئی تو بستی سے جانے کا وقت آیا۔ روانگی سے پہلے وہ ہیڈماسٹر صاحب سے ملنا چاہتے تھے تاکہ انہیں اپنی تحقیق سے آگاہ کریں اور ایک اہم ذمہ داری ان کے سپرد کر کے رخصت ہوں۔

ہیڈ ماسٹر ریاض بخش کی پیشانی پر شکنیں گہری ہوگئیں۔ انہوں نے کہا، سنا تھا کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ قدیم ادیب کی باتیں سن کر شش و پنج میں ہوں یہ 10 ہزار سال قبل کا ذکر ہے یا۔۔۔؟ وہ کہتے کہتے رک گئے پھر سر جھٹک کر کہا، حرف بہ حرف موجودہ دنیا کا عکس ہے۔ آج ہر معاشرہ فرقوں میں تقسیم ہے۔ الہامی تعلیمات سے منہ موڑلیا گیا ہے۔ ترقی، تباہی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ بیماریوں سے دنیا پریشان ہے۔ موجودہ دور کا محقق بھی قدیم محققین کی طرح ایسی ایجادات کرنا چاہتا ہے جو عام آدمی کے دماغ کو کنٹرول کریں۔

پروفیسر صاحب نے معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا کہ کوئی ڈیڑھ عشرہ قبل ایسے تجربات کا دعویٰ ایک ترقی یافتہ ملک نے بھی کیا تھا۔ انہوں نے نینو چِپ کے ذریعے ایک شخص کے دماغ کی یادداشت نقل کر کے دوسرے شخص کو منتقل کرنے کی کوشش کی اور دنیا کو بتایا کہ ہم نے پیراسائیکالوجی اور جینیاتی سائنس کا سہارا لے کر دوسرے شخص کے جینیاتی کوڈ میں ردّوبدل کیا ہے تاکہ وہ پہلے شخص کے خیالات قبول کر سکے۔ تاہم اس بارے میں تفصیلات اب تک راز ہیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا، ادیب کا ذہن روایات اور معاشرے سے متاثر ہوتا ہے اس لئے قلم اپنے دور اور معاشرتی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔

پروفیسر عثمان وضاحتی انداز میں بولے، ادیب نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ملک بازیستان کے

معاشرتی اور انتظامی ڈھانچے کی قباحتوں پر روشنی پڑتی ہے اور دیمک زدہ، کھوکھلے انتظامی نظام سے پردہ اٹھتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ بازیستان کا ایک ادارہ جو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے قائم کیا گیا ہے، رشوت لے کر وظائف دیتا ہے۔ سفارش یا رشوت کے بغیر وظیفہ نہیں ملتا۔ تعلقات کی بنیاد پر وہ لوگ بھی وظائف حاصل کر لیتے ہیں، جو وظیفے کے مستحق نہیں۔ ڈائری میں لکھا ہے کہ دنیا میں طبقاتی فرق بڑھ گیا ہے۔ نچلے طبقے کو ذہنی طور پر اتنا مفلوج کر دیا گیا ہے کہ آواز نہ اٹھا سکے۔

اور کیا لکھا ہے؟ ہیڈ ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

ڈائری کے آخری صفحات میں عجیب انکشاف ہے جو اس دور میں جینیاتی سائنس کے عروج کی نشان دہی کرتا ہے۔

وہ کیا ہے؟ بے تابی سے پوچھا۔

پروفیسر عثمان نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا، اس کا انکشاف آج کی دنیا کے لئے حیران کن ہے۔ سیاق و سباق بیان کر کے جینیاتی سائنس میں تحقیق کے حوالے سے ادیب نے لکھا ہے کہ کسی فرد کے خاندان اور اسلاف کے کردار کے ہزاروں برس کا ریکارڈ اس فرد کی جینوم میں تبدیلی کا موجب بنتا ہے۔ یہ مسلسل عمل ہے جو نسل در نسل چل کر ہزاروں سال پر محیط ہو جاتا ہے۔ ادیب نے لب لباب بتاتے ہوئے مثال دی ہے کہ ایک شخص جو قاتل، ذخیرہ اندوز یا زرپرست ہے، کسی کی حق تلفی کر کے ناجائز ذرائع سے سرمایہ جمع کرتا ہے تو اس عمل سے اس کے جینیاتی کوڈز میں ایسے عناصر کا غلبہ ہوتا ہے جن سے منفی کردار کی داغ بیل پڑتی ہے اور اس کردار میں توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ جینیاتی کوڈز آنے والی نسلوں کو منتقل ہوتے ہیں۔ جب آئندہ نسل کا کوئی فرد منفی ماحول کے زیر اثر یہی طرز عمل اختیار کرتا ہے تو منفی کردار کے جینیاتی کوڈز میں مزید توانائی جمع ہوتی ہے۔ سلسلہ نسل در نسل جاری رہنے سے آخر کار ایسے مرحلے پر پہنچتا ہے جہاں فرد کو محض ترغیب اور تلقین سے مثبت طرز عمل پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثبت طرز عمل قبول کرنے کے وصف سے محرومی سے آنے والی نسلوں میں دماغی سقم پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے اجداد کی طرح مثبت خیال قبول نہیں کرتے اور وسوسوں میں مبتلا رہتے ہیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب یک دم بولے، اس حقیقت کی طرف تو قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔

> "یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے۔" (البقرۃ: ۱۸)

اپنے حال کا جائزہ لیتے رہنا چاہئے اور اصلاح کر کے اللہ سے خیر و عافیت کی دعا مانگنی چاہئے۔

پروفیسر صاحب نے متانت سے کہا، کردار کا مخزن خیالات ہیں۔ کردار کا مظاہرہ سوچ سے ہوتا

ہے۔ جب مثبت خیال قبول نہ کرنا عادت بن جائے تو آدمی کے اندر جینیاتی طور پر درندگی، سفاکی اور بربریت کے نقوش مستحکم ہو جاتے ہیں اور ظلم، ظلم محسوس نہیں ہوتا۔

ادیب نے لکھا ہے کہ جب ایک سائنسی ادارہ جینیات پر تحقیق کر کے نتائج منظر عام پر لایا تو ان نتائج کو غائب کر دیا گیا — کیوں کہ سرمائے پر وہ لوگ قابض ہیں جن کے جینیاتی کوڈ میں منفی رخ غالب ہو چکا ہے۔ ادیب تاسف کا اظہار کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے کہ ہو سکتا ہے وہ وقت دور نہیں جب مطلق ہستی لوگوں کی نافرمانی کے سبب دنیا کو غرقِ آب کر دے گی کیوں کہ ان لوگوں نے اصلاح کا راستہ خود پر بند کر لیا ہے۔

ہیڈ ماسٹر ریاض بخش نے جو انہماک سے پروفیسر صاحب کی باتیں سن رہے تھے، چونک کر پوچھا، پروفیسر صاحب! کیا ہم یہ سمجھیں کہ ہماری دنیا بھی غرقِ آب ہونے والی ہے؟

پروفیسر صاحب نے چند لمحے سوچ کر جواب دیا، عالمی منظر نامہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کا موازنہ ڈائری میں دیئے گئے احوال کے مطابق اگر 10 ہزار برس قبل کے عالمی منظر نامے سے کیا جائے تو یقین کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہ دنیا بھی تباہی کے دہانے پر ہے — اگر ہم نے اپنا عمل درست نہ کیا تو میرے دوست ! ماضی کی اقوام کی طرح بھیانک انجام سے دو چار ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو تباہی سے محفوظ رکھے، آمین۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ سوال ہوا نہ جواب۔

پھر پروفیسر عثمان گویا ہوئے، دس ہزار برس قبل کی دنیا کی ایک زبان سیکھنے میں مجھے پچاس برس لگ گئے۔ جہاں کہیں اس زبان کی باقیات دستیاب تھیں، حاصل کیں اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب پردہ اٹھا تو وہی دنیا سامنے آئی جو آج ہے۔ لگتا ہے کہ ہر دور گزشتہ دور کی تصویر ہے۔ عروج کے بعد زوال اور زوال کے بعد عروج آتا ہے پھر زوال ہو جاتا ہے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے استفسار کیا، آپ نے بچوں سے دور رہ کر اس قصبے میں رہائش کیوں اختیار کی؟

پروفیسر عثمان جو کافی دیر سے باتیں کر رہے تھے، گہرا سانس لے کر بولے، دراصل قدیم زبان کو سیکھنے، سمجھنے اور مشق کے لئے تنہائی اور یکسوئی چاہیئے تھی۔ یکسوئی سے دماغ کے خوابیدہ گوشے بیدار ہوتے ہیں اور ذہنی استعداد بڑھتی ہے۔ جب ذہن ایک خیال پر مرتکز رہے تو نہاں پہلو عیاں ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے میں نے تحقیقی کام کے لئے اس قصبے کا انتخاب کیا۔ بچوں سے بات ہوتی

رہتی ہے۔ احباب میں کم لوگوں کو میری یہاں سکونت کا علم ہے۔ یہ طویل المدت، صبر آزما تحقیقی کام تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ مقصد میں کام یاب ہوگیا۔ پرسوں میری روانگی ہے اور یہ میری آپ سے آخری ملاقات ہے۔ چاہتا ہوں کہ میرے بعد آپ اس حویلی کو تحقیقی مرکز میں تبدیل کردیں۔ محقق اور معلم کا کام علم منتقل کرنا ہے۔ یہاں کی کتابیں آپ کی تحویل میں دے کر جارہا ہوں، یہ آنے والی نسلوں کی امانت ہیں۔

لیکن آپ کہاں جارہے ہیں؟

جہاں میری ضرورت ہے۔ میں دنیا کو تباہی سے بچانے کے لئے ان لوگوں کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں جو کارِ خیر میں مصروف ہیں۔ اس بارے میں زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتا۔

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب نے حویلی کی چابی ہیڈ ماسٹر صاحب کے سپرد کی اور الوداع کہتے ہوئے اندر گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب انہیں جاتا ہوا دیکھ کر سوچ رہے تھے کہ علم سے محبت کرنے والا کیسا شخص ہے کہ زندگی کے 50 سال معدوم زبان سیکھنے میں لگادیئے اور جاتے جاتے دنیا کو پیغام دے گیا کہ تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔ (آخری قسط)

زندگی کی مقداریں معین ہیں

تخلیقی فارمولوں پر غور کرنے والا طالب علم جب انہماک کے نقطۂ عروج میں داخل ہوتا ہے تو اس پر وہ علوم منکشف ہوتے ہیں جن کی ابتدا لامحدودیت سے ہوتی ہے۔ ایسا طالب علم تدبّر اور تفکر کی کسوٹی پر مشاہدہ اور تجزیہ کرکے جان لیتا ہے کہ فضائے بسیط میں گیسوں کا آمیزہ زمین کو زندگی بخشتا ہے۔ بارش اور ہواؤں کا انتظام، کاربن، آکسیجن وغیرہ کا مشاہدہ اس کے لئے عام بات بن جاتی ہے۔ وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ کرۂ ارض کا حجم معین مقداروں پر قائم ہے۔ اگر حجم زیادہ ہوتا تو کششِ ثقل کی زیادتی کی وجہ سے ہوا (کاربن ڈائی آکسائیڈ) خلا میں منتشر ہونے کے بجائے زمین کی سطح سے آ چمٹتی اور مخلوق کا سانس لینا دشوار ہوجاتا۔ چاند اور سورج سے زمین کا فاصلہ بھی معین مقداروں پر قائم ہے۔ اگر زمین سورج سے معین مقداروں کی نسبت زیادہ دور ہوتی تو تمام کرہ یخ بستہ ہوتا۔ برف کی دبیز سِلوں کے علاوہ زمین پر کسی چیز کا وجود نہ ہوتا۔ اور اگر یہ فاصلہ معین مقداروں سے کم ہوتا تو سورج کی تپش فصلوں کو جلا کر راکھ کردیتی۔ چاند اور زمین کے فاصلے میں اگر معین مقداریں ٹوٹ جائیں تو مدوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوجائیں گی کہ ساری زمین سمندر کی طوفانی لہروں میں غرق ہوجائے گی۔

عثمان طاہر

دُہری شخصیت

مسکرانا چاہتے ہو تو سب کو مسکراہٹ دو۔ تکلیف پسند نہیں تو آزار پہنچانے سے گریز کرو۔ کام یابی کی تمنا ہے تو کسی کو ناکام کرنے کی کوشش مت کرو۔ عزت کی طلب ہے تو دوسروں کی بے عزتی سے گریز کرو۔

ذہن ایک مرکز پر قائم نہ ہو تو شخصیت دہری ہوتی ہے۔ اس میزان پر خود کو پرکھنے سے تصویر واضح ہوتی ہے کہ ہم کہاں ہیں—؟ معاشرے پر طائرانہ نظر ڈالیں تو تقریباً ہر ایک افراتفری میں ہے، سب کی زبان پر شکوے ہیں، آنکھوں میں شکایت ہے، چہرے پر تناؤ ہے، الفاظ میں سختی ہے، مسکراہٹ کھو گئی ہے، سکون در کنار ہے اور بے یقینی سایہ کئے ہوئے ہے۔ وجہ سوچ کا ایسے مقام پر ٹھہرنا ہے جس میں انتشار اور شکوک ہیں۔ شک سے ذہن میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے اور آدمی ٹوٹے پھوٹے ذہن سے زندگی کو دیکھتا ہے۔

شخصیت ترازو کی مانند ہے۔ ترازو کا پلڑا دائیں طرف جھکا ہو تو بائیں طرف تناؤ بڑھتا ہے۔ پلڑا بائیں جانب جھکا ہو تو دائیں جانب تناؤ میں اضافہ ہوتا ہے۔ فرد دونوں حالت میں متضاد رخ کے دباؤ کو محسوس کرتا ہے، اور ذہن تقسیم رہتا ہے۔ جب میزان برابر ہوتی ہے تو ترازو کے پلڑے نیوٹرل ہو جاتے ہیں اور قوت اس مقام پر منتقل ہوتی ہے جہاں ان دونوں کا مرکز ہے۔ دائیں بائیں پلڑوں نے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کے بجائے خود کو اپنے مرکز کے سپرد کر دیا۔ مرکز نیوٹرل یا غیر جانب دار ہے جس نے دونوں جانب توانائی برابر تقسیم کر کے میزان قائم کر دی۔

میزان قائم رہنے سے معاشرہ بنتا ہے۔ ہم خود آزاد رہنا چاہتے ہیں مگر دوسروں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ہمارے مطابق زندگی گزاریں۔ یہ دہری شخصیت ہے جو تناؤ پیدا کرتی ہے۔ گھر میں بہو آتی ہے تو ساس اور نندیں چاہتی ہیں کہ وہ ہماری مرضی کے مطابق چلے۔ بہو کو یہ رویہ قبول نہیں۔ یہی بہو اپنے میکے میں نند ہے اور چاہتی ہے کہ بھابھی ہماری مرضی پر چلے۔ ہر ایک دہرا معیار اور دہری شخصیت کی وجہ سے گھر، خاندان اور معاشرے کو غیر متوازن بنا رہا ہے۔ ساس بہو کے علاوہ جتنے معاشرتی رشتے ہیں، ان میں

چپقلش کی جڑ متضاد رویے ہیں۔

رسول کریمؐ کا ارشادِ گرامی ہے:

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔" (صحیح بخاری)

ارشادِ گرامی میں مساوات اور انصاف پر مبنی مثالی معاشرے کی تعمیر کا اصول بیان کیا گیا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ مسکرانا چاہتے ہو تو سب کو مسکراہٹ دو۔ تکلیف پسند نہیں تو آزار پہنچانے سے گریز کرو۔ کامیابی کی تمنا ہے تو کسی کو ناکام کرنے کی کوشش مت کرو۔ عزت کی طلب ہے تو دوسروں کی بے عزتی سے گریز کرو۔ آگے بڑھنے کی آرزو ہے تو پیچھے آنے والوں کے لئے راستہ بناؤ۔ سکون کی تلاش ہے تو دیکھو کہ تم کس کی زندگی میں بے سکونی کا سبب بن رہے ہو۔

رسول کریمؐ کا ارشادِ گرامی آفاقی قانون ہے جس پر عمل کرنے سے ہم دہری شخصیت کے آزار سے محفوظ ہوں گے، گھر میں سکون ہو گا، خاندان متحد رہے گا اور معاشرہ مثالی بن جائے گا۔

کتنے لوگ ایسے ہیں جو خاندانی مسائل سے بچنے کے لئے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ خاندان میں مسائل پیدا کرنے اور لگائی بجھائی کرنے والے افراد بھی ہوتے ہیں لیکن حل یہ نہیں ہے کہ سب سے ملنا چھوڑ دیں۔ آدمی کو کچے کانوں کا نہیں ہونا چاہئے۔ زید بتائے کہ حامد نے تمہاری برائی کی ہے تو حامد سے ناراض ہونے کے بجائے براہِ راست پوچھ لیں کہ اسے آپ سے کیا شکایت ہے، اور شکایت دور کریں۔ اس طرح حامد اور زید دونوں محتاط رہیں گے۔

فطرت میں مل جل کر رہنا ہے۔ میل ملاپ سے زندگی میں دلچسپی اور دلکشی پیدا ہوتی ہے، خوشی کا دائرہ پھیلتا ہے اور مثبت سرگرمیوں کے راستے کھلتے ہیں۔ تنہائی اچھی ساتھی ہے۔ اپنے آپ کو روزانہ کچھ وقت ضرور دیں مگر سب سے کٹ کر رہنے کا فیصلہ مایوسی اور چڑچڑے پن میں مبتلا کر دیتا ہے۔ خوشی اور غم میں اپنوں کی کمی محسوس ہوتی ہے کیوں کہ فطرت نے آدمی کو آدمی کی دوا بنایا ہے۔ جب زندگی سب کے ساتھ رہ کر خوشی سے گزرتی ہے تو سوچنا یہ ہے کہ مل جل کر کیسے رہیں۔

جسم کئی حصوں پر مشتمل وجود ہے جیسے مشین پرزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا پرزہ خراب ہو جائے، پوری مشین بے کار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کوئی عضو کام کرنا چھوڑ دے تو سارے اعضا متاثر ہوتے ہیں۔ معاشرہ بھی وجود ہے اور افراد اس کے اعضا ہیں۔ جن سے پریشان ہو کر ہم

الگ تھلگ ہوئے ہیں، کبھی ان کی بھی رائے لیں کہ وہ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور ہم سے کیا شکایت ہے۔ ہمارا اور ان کا طرز عمل ایک ہے۔ ہمیں ان کی بات بری لگی اور انہوں نے سنی سنائی بات پر یقین کرلیا۔ دونوں بد ظن ہوگئے۔ وہ ہم سے ملنا نہیں چاہتے، ہم ان کو دیکھنے کے روادار نہیں۔ درمیان میں کچھ لوگوں کو شر پھیلانے اور فساد کرنے کا موقع ملتا ہے، ان سے محتاط رہنا چاہئے لیکن عمومی طور پر رنجش رکھنا فراست نہیں۔ اکائی بننے سے خوشیاں دوبالا ہوتی ہیں اور دکھ درد بانٹنے والے مل جاتے ہیں۔

خاندان میں شادی ہوتی ہے تو تقریب کو یادگار بنانے کے لئے سب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اگر رنجشوں کو اہمیت دی جائے اور دنیاداری کی وجہ سے مجبوراً شادی کے موقع پر اکٹھے ہوں تو خوشی کے موقع پر بھی دماغ پر بوجھ محسوس ہوتا ہے کیوں کہ سب کو پتہ ہے کہ ایک دو دن کا ملنا ہے پھر تو کون اور میں کون!

مل جل کر رہنے کا مشکل لیکن آسان طریقہ ظرف بڑا رکھنا ہے۔ ہر ایک کا مزاج الگ ہے، حالات الگ ہیں، جذبات الگ ہیں اور خواہشات الگ ہیں۔ وہ اس کے مطابق رد عمل ظاہر کرتا ہے اس لئے ناگوار باتیں نظر انداز کردیں۔

جو جذبہ خاندان کو جوڑ کر رکھتا ہے وہ ہمدردی ہے۔ مدد کا انتظار کرنے سے پہلے آگے بڑھ کر خود مدد کریں۔ یقین مانئے اگر کوئی ناراض ہے تو ناراضی بھول جائے گا۔ مثبت قدم کی توانائی کدورت کو یکسر مٹا دیتی ہے۔ مل جل کر رہنے کا مقصد یہی ہے کہ نرمی اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں۔

ہم نے یہی پڑھا ہے کہ قول و فعل میں تضاد رکھنے والے لوگ دہری شخصیت رکھتے ہیں اور یہ درست ہے لیکن دہری شخصیت کے معنی وسیع ہیں۔ جن لوگوں کا ذہن ایک مرکز پر قائم نہیں، ان کی شخصیت ایک نہیں ہوتی۔ وہ جگہ، موقع اور حالات دیکھ کر تشخص تبدیل کرلیتے ہیں۔ خوشی میں خوشی کا لبادہ اوڑھتے ہیں اور غم میں مایوسی طاری ہوجاتی ہے۔ غصے میں غضب کی تصویر بنتے ہیں اور نرمی میں ملائم ہوجاتے ہیں، سکون کی کیفیت میں دنیا کو اچھا کہتے ہیں اور بے سکونی میں بیزاری کا اظہار ہوتا ہے، محبت میں سب کچھ نچھاور کرتے ہیں اور نفرت میں جینا محال کردیتے ہیں۔ مستقل ایک حالت میں رہنا ان کی طبیعت میں شامل نہیں کیوں کہ ان کا ذہن رشتوں کو شک اور خود غرضی کے لینس سے دیکھتا ہے۔

محترم عظیمی صاحب فرماتے ہیں:

”ہر شے کا ایک تشخص ہے، خواہ ہم اسے غیر مرئی سمجھیں اور کوئی اہمیت نہ دیں۔ جب آدمی

کسی خواہش کی تکمیل کو اپنا نصب العین بنالیتا ہے تو در حقیقت وہ اس کے تشخص کو اپنے اوپر محیط کرلیتا ہے۔ اگر انسان کا مطمح نظر ذاتی مفاد ہے تو وہ خاکی جسم میں مقید ہو جاتا ہے جہاں تنگی ہے، گھٹن ہے، اندھیرا ہے۔ وہ اس تشخص کے طول و عرض میں بند رہتا ہے، باہر نہیں نکل سکتا۔

تیرہ و تاریک قید خانے میں بند قیدی کی طرح اس کا رابطہ وسیع و عریض ماورا رنگین دنیا سے باقی نہیں رہتا۔" (کتاب: کشکول)

دنیا میں ہر شے کوئی نہ کوئی صفت رکھتی ہے۔ کسی سے متاثر ہونے یا اس کا اثر قبول کرنے سے دراصل ہم اپنے تشخص کو مغلوب کر کے اس کا تشخص اپنا لیتے ہیں۔ تغیر قبول کرنے سے تغیر کی صفات منتقل ہوتی ہیں اور حقیقت قبول کرنے سے بندہ اپنی اصل سے قریب ہو جاتا ہے۔

سلسلہ عظیمیہ کے قواعد و ضوابط کی پہلی شق میں تشخص کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔

"ہر حال اور ہر قال میں اپنا روحانی تشخص برقرار رکھیں۔"

روحانی تشخص کیا ہے——؟ اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے اور تخلیقی فارمولوں کا علم "علم الاسماء" عطا کیا ہے۔

تخلیق مقداروں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ کوئی بھی شے اکیلے وجود میں نہیں آتی، اس میں دوسری مقداریں شامل ہوتی ہیں۔ بارش کے پانی میں متفرق عناصر شامل ہونے کی وجہ سے زمین پر لاشمار رنگوں کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ پانی تخلیق ہے اور اس کا مخصوص فارمولا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

"اور دیکھو زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دہرے۔ سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے۔ اور مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کم تر۔ ان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔" (الرعد: ۴)

نوعِ آدم کا روحانی تشخص یہ ہے کہ وہ اپنے جد امجد بابا آدمؑ کو دیئے گئے علم سے واقف ہو اور حقیقت کا مشاہدہ کرلے کہ یہاں ہر شے اللہ کی طرف سے ہے۔ اس مرحلے پر ذہن ایک نقطے میں راسخ ہو جاتا ہے کہ ہر شے من جانب اللہ ہے۔

روحانی تشخص قائم کئے بغیر ہم دہری شخصیت سے نہیں نکل سکتے۔ ہمیں دہرے پن سے دور رہنا ہو گا یعنی خوشی اور غم —— دونوں میں خوش رہیں۔ کوئی اچھا کہے یا برا، اندر کا سکون متاثر نہ ہو۔ غصہ آئے تو بردباری کا دامن نہ چھوڑیں کیوں کہ معاشرہ اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک فرد خود کو تبدیل نہ کرے۔

اقتباسات

"ماہنامہ قلندر شعور" کو گلدستہ بنانے کے لئے قارئین کی کوشش قابل قدر ہے۔ قرآن کریم، آسمانی کتابوں، ملفوظات، تاریخ، انکشافات اور سائنسی فارمولے بھیج کر اس رسالے کا حصہ بن سکتے ہیں۔ تحریر کم و بیش 120 الفاظ پر مشتمل ہو۔

عباسی سلطنت کے خلیفہ ہارون رشید نے دیکھا کہ اس کے بیٹے مامون اور امین اس بات پر جھگڑ رہے ہیں کہ ان میں سے کون استاد کے جوتے اٹھائے گا۔ فیصلہ ہوا کہ دونوں ایک ایک جوتا اٹھائیں گے۔ اگلے دن خلیفہ ہارون نے دربار میں حاضرین سے پوچھا کہ میری مملکت میں سب سے زیادہ عزت کس کی ہے؟ جواب دیا گیا کہ خلیفہ کی عزت سب سے زیادہ ہے۔ خلیفہ ہارون نے کہا کہ نہیں! سب سے زیادہ عزت استاد کی ہے جس کے جوتے اٹھانے پر شہزادے فخر محسوس کرتے ہیں۔

(مرسلہ: ثوبیہ سلمان۔ کراچی)

جس طرح انسان سونے پر مجبور ہے اسی طرح بیداری بھی اس کی مجبوری ہے۔ وہ ان دونوں حالتوں میں سے کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔ زندگی کا سفر ان ہی دو حالتوں میں جاری ہے۔

بیداری کی حالت میں کوئی آدمی اپنی زندگی کے سارے تقاضے اور ساری حرکات و سکنات، واردات و کیفیات، توہمات، خیالات، تصورات، احساسات کا رشتہ گوشت پوست کے جسم سے قائم کرتا ہے اور ان سب کو گوشت پوست کے جسم کے تابع تصور کرتا ہے۔ اس کے برعکس سونے کی حالت میں اس کا رشتہ گوشت پوست کے جسم سے غیر شعوری رہ جاتا ہے۔ گہری نیند میں اس کا ذہنی ربط اور تعلق جسمِ انسانی سے وہ نہیں رہتا جو بیداری میں ہوتا ہے لیکن وہ زندہ رہتا ہے۔ سانس کی آمد و شد برقرار رہتی ہے۔ دوسرے تجربے میں جو انسان پر وارد ہوتا ہے وہ موت ہے۔ جب تک جسم سے روح کا تعلق رہتا ہے، جسمانی حرکات و سکنات قائم رہتی ہیں اور جب یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، جسمانی حرکات و سکنات ختم ہو جاتی ہیں۔

(مرسلہ: ہاشم سلیمان۔ کراچی، کتاب: آگہی)

من میں سوالات اٹھتے ہیں ۔ فرد جواب کی تلاش میں نگر نگر کی خاک چھانتا ہے، قریہ قریہ گھومتا ہے، صحراؤں اور جنگلوں میں سے گزرتا ہے، زندگی کے اتار چڑھاؤ دیکھتا ہے ، سوالوں کا جواب ہر مقام پر موجود ہوتا ہے لیکن اسے نہیں ملتا۔ پھر ان ہی مقامات سے دوبارہ گزرتے ہوئے سارے جواب مل جاتے ہیں اور راز کھلتا ہے کہ مقدر سے زیادہ اور وقت سے پہلے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی نہ کوئی شے ملتی ہے۔

(مرسلہ: مدیحہ عبید، متحدہ عرب امارات)

زندگی کی تکمیل دو چیزوں سے ہوتی ہے۔ جلال اور جمال سے۔ ان ہر دو کے مظاہر بے شمار ہیں۔ جلال ایک طرف سمندروں اور کہساروں میں پایا جاتا ہے اور دوسری طرف تلوار، سلطنت اور دولت میں لیکن جمال کا سب سے بڑا مظہر علم اور عشق ہے۔ جب علم و عشق ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں تو مہینوں کی منزلیں دنوں میں طے ہو جاتی ہیں۔ (مرسلہ: محمد شاہد خان، کتاب: مسائلِ نو)

دنیا میں ہر وقت اللہ کے ایسے بندے موجود رہتے ہیں جو شہود اور باطنی نعمتوں سے مالا مال ہوتے ہیں ۔ جب وہ دنیا میں اکثریت کے عمل کا تجزیہ کرتے ہیں تو انہیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ لوگ چند روز کی زندگی کو اصل زندگی سمجھے ہوئے ہیں۔ لیکن جلد ہی اس کی وجہ بھی ان کی نظر میں آجاتی ہے اور وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ سچ تو یہ ہے کہ بے خودی، خودی سے اور موت زندگی سے اعلیٰ ہے۔ لیکن دنیا کے باسیوں پر عدم کا یہ راز روشن نہیں ہے۔ اصل زندگی وہی ہے جو مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے۔

(مرسلہ: محمد حمزہ، فیصل آباد، کتاب: کشکول)

محبت دنیا کا سب سے خوب صورت جذبہ ہے۔ سونا جس طرح تپ کر کندن بنتا ہے اسی طرح محبت اپنی خالص ترین شکل میں ڈھلتی ہے تو "ممتا" بن جاتی ہے اور ممتا وہ جذبہ ہے جو کائنات کو متحد رکھنے میں، جوڑنے میں اور اس کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں سب سے زیادہ کام کرتا ہے۔

(مرسلہ: فوزیہ گل۔ پشاور، کتاب: عہد الست)

لازمانیت میں وقت کی موجودگی نہیں ہے۔ وقت کا تانا بانا صرف زمانیت میں ہے۔ انسان اگر وقت کی حیثیت سمجھ کر وقت کی نفی کردے تو لاریب لازمانیت میں قدم رکھ دیتا ہے اور جیسے ہی لازمانیت میں قدم مستحکم ہو جاتے ہیں، وقت کے ساتھ بندھی ہوئی ہر تخلیق اس کے لئے مسخر ہو جاتی ہے۔ (مرسلہ: رابعہ طارق۔ پھالیہ)

نیرّ اعظم

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

گزرا ہوا وقت یاد کرنے سے آدمی خوف و غم اور خوشی ناخوشی کے بھنور میں پھنس جاتا ہے جب کہ یاد نہ کر کے آدمی اچھا اور برا دونوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور نیوٹرل ذہن حاصل ہوتا ہے۔

کسی سلطنت میں نوکری کے لئے دوسرے ملک سے لوگ آئے۔ ان میں سے کچھ انتظامی عہدوں پر فائز ہوئے اور باقی ان کے ماتحت تھے۔ یہ سب منہ اندھیرے اٹھنے کے عادی تھے۔ ورزش کے بعد تازہ دم ہو کر علیٰ الصباح ناشتا کرتے اور وقت پر دفتر پہنچتے۔ خط پڑھتے، جواب لکھتے، دفتری امور سے متعلق اہم فیصلے ہوتے اور ان پر عمل درآمد کیا جاتا تھا۔ دوپہر تک کام کا بڑا حصہ نمٹا کر جب کھانے کا وقفہ ہوتا تو اس وقت سلطنت کے بادشاہ اور وزیروں کی صبح ہوتی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے وقت بادشاہ کے لئے ناشتا تیار ہوتا اور وزرا دربار پہنچنے کی تیاری کرتے۔

اگر پوچھا جائے کہ اس سلطنت میں کچھ عرصے بعد کس کی حکومت تھی تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

آپ کے پاس پانی کے دو گھڑے ہیں۔ ایک صحیح سلامت جب کہ دوسرے میں سوراخ ہے اور پانی قطرہ قطرہ مسلسل بہہ رہا ہے۔ پانی نکالنے کے لئے کس گھڑے کو پہلے ترجیح دی جائے گی ——؟

وہ گھڑا جس میں سوراخ ہے اور پانی گرنے سے روکا نہیں جا سکتا، وقت کی بہترین مثال ہے، وقت جو کبھی نہیں رکتا اور کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

شاعر کا کہنا ہے:

تم چلو اس کے ساتھ یا نہ چلو
پاؤں رکتے نہیں زمانے کے

برف بیچنے والا، برف کی سل لے کر بازار میں آتا ہے، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ برف کی سل مسلسل پگھلتی ہے مگر خریدار کوئی نہیں۔ بوند بوند گرنے کے بجائے اگر پانی کام میں آجاتا تو فائدہ ہوتا۔ گرنے والی بوند لوٹ کر نہیں آتی جیسے گیا وقت واپس نہیں آتا۔ زندگی لمحہ بہ لمحہ اسی روش پر گزر رہی ہے۔ جس لمحے کا صحیح استعمال کیا جائے، وہ فائدہ مند ہے ورنہ برف کے پگھلنے کی طرح زندگی ضائع ہو رہی ہے۔

کام وقت پر نہ کرنے کا آسان بہانہ کل پر ٹالنا ہے۔ سب جانتے ہیں، کل آتی نہیں۔ یہ وہ سہانا سپنا ہے جس میں کھو کر ہوش اس وقت آتا ہے جب دیر ہو جاتی ہے۔

سدا عیشِ دوراں دکھاتا نہیں
گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

مثل ہے کہ کل کا کام آج کرو اور آج کا ابھی۔

زندگی کے لئے جہدِ مسلسل درکار ہے۔ آرام طلبی سے کاہلی پروان چڑھتی ہے۔ اکثر بیماریوں کی ابتدا پیٹ سے ہوتی ہے۔ پیٹ صرف زیادہ کھانے سے خراب نہیں ہوتا، کاہلی اور آرام طلبی بھی پیٹ کی خرابی میں کردار ادا کرتی ہے۔ معالجین ہائی بلڈ پریشر، امراضِ قلب، ذیابیطس اور دوسری بیماریوں میں پیدل چلنے کی تاکید کرتے ہیں۔ چلنے سے اعضا کی ورزش ہوتی ہے اور صحت بھی اچھی ہو جاتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”در حقیقت ہم نے انسان کو مشقّت میں پیدا کیا ہے۔“ (البلد:۴)

حرکت سے اعضا میں لچک برقرار رہتی ہے جب کہ آرام پسندی پریشانی کا سامان اور کل کے انتظار میں آج ضائع کر کے مستقبل کو کھونے کا انتظام ہے جب کہ جن کا حوصلہ جواں ہے، وہ کہتے ہیں:

ہار ہو جاتی ہے جب مان لیا جاتا ہے
جیت تب ہوتی ہے جب ٹھان لیا جاتا ہے

”ہم وقت گزار رہے ہیں“، اس غلط فہمی میں کئی لوگ گرفتار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وقت ایک بیلٹ ہے جس پر سے ہم گزر رہے ہیں۔ سفر کو جتنا کارآمد بنایا جائے، وہی ہمارا سرمایہ ہے، باقی سب خسارہ ہے۔ زیادہ وقت خیالی پلاؤ پکانے میں گزرتا ہے جو ذہنی عیاشی ہے۔ اس کی عادت پڑ جائے تو پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں،

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

ہمارا مقام آسمانوں کو تسخیر کرنا ہے۔ اگر شاہین عیش و عشرت میں پڑ جائے تو بے عملی اسے شکاری کے بجائے شکار بنا دیتی ہے۔ عمل سے راستہ بنتا ہے جب کہ بے عملی سے بند ہو جاتا ہے۔ بے عملی کی سب سے بڑی وجہ کاہلی اور تاخیر کی عادت ہے۔

کہتے ہیں کہ عقل مند کی ڈائری میں کل کا لفظ نہیں ہوتا۔ یہ لفظ ناعاقبت اندیش کی لغت میں ملتا ہے۔ کل کے انتظار میں ہر کام اس وقت کیا جاتا ہے جب وہ ناگزیر ہو جائے۔ مثلاً بل یا فیس جمع کروانے کی آخری تاریخ کا انتظار، رمضان کے آخری عشرے میں یا چاند رات کو عید کی خریداری کرنا، صبح اٹھ کر کپڑے استری کرنا وغیرہ۔ یہ کام وقت پر انجام نہ دینے کا مظاہرہ ہے۔ وقت پر کام کرنے سے پریشانی سے بچا جا سکتا ہے۔ صبح لائٹ

چلی جائے اور کپڑے استری نہ ہوسکیں یا بل جمع کروانے کی آخری تاریخ میں مسئلہ پیش آجائے تو ایسا فرد کام نہ ہونے کا الزام دوسروں کو دیتا ہے۔ اسے احساس ہونا چاہئے کہ میں نے سستی کا مظاہرہ کرکے وقت پر کام نہیں کیا۔

امام ابن جوزیؒ فرماتے ہیں:

”صفرا کی زیادتی کا مریض اگر سکنج بین پینے کے بجائے اس کو بنانے کی ترکیب سیکھنے میں عمر لگا دے تو اس نے زندگی برباد کردی۔ وہ شخص خوش قسمت ہے جو ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرے اور غیر ضروری چیزیں چھوڑ دے۔“

گلہ شکوہ کرنا اور پریشانی پر رونا بھی وقت ضائع کرنا ہے۔ ابدالِ حق قلندر بابا اولیاؒ فرماتے ہیں:

اچھی ہے بری ہے دہر فریاد نہ کر
جو کچھ کہ گزر گیا اسے یاد نہ کر
دو چار نفس عمر ملی ہے تجھ کو
دو چار نفس عمر کو برباد نہ کر

اچھا، برا یا جو کچھ گزر گیا اس کو دہرانا، زندگی گزارنے کے لئے دیئے گئے وقت کو برباد کرنا ہے۔ گزرا ہوا وقت یاد کرنے سے آدمی خوف و غم اور خوشی ناخوشی کے بھنور میں پھنس جاتا ہے جب کہ یاد نہ کرکے آدمی اچھا اور برا دونوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور نیوٹرل ذہن حاصل ہوتا ہے۔

زندگی کو طویل سمجھنے والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ گزری ہوئی زندگی چند لمحوں میں نظر کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ جو کہانی دو چار نفس میں سما جائے، اسے 70 یا 80 سالوں پر محیط سمجھنا کیا ہے؟

ابدالِ حق فرماتے ہیں،

”وقت ہر انسان کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ہر انسان چاہے وہ غریب ہو یا امیر، چھوٹا ہو یا بڑا، اسے روزانہ وقت کے سرمائے کی بھری ہوئی تھیلی سونپ دی جاتی ہے۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے کی تھیلی سے فائدہ اٹھاتا ہے یا اسے ضائع کر دیتا ہے۔ اگر انسان وقت کی اہمیت کو سمجھ لے تو اس پر علم کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ کامیاب زندگی گزارتا ہے۔“

وقت کا بہترین استعمال ہر لمحے کا آگہی بننا ہے، کچھ نہ کچھ تخلیق کرنا اور افکار کی دنیا میں سفر ہے۔

میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:

بس کر میاں محمد بخشا، موڑ قلم دا گھوڑا
ساری عمر دُکھ نئیں مُکنے، ورقہ رہ گیا تھوڑا

زندگی دکھ سکھ کا مجموعہ ہے۔ اگر ہم کوشش میں لگے رہیں کہ دکھ نہ آئے تو یہ بے وقوفی ہے کیوں کہ دکھ کی پہچان سکھ سے ہے۔ محمد بخشؒ فرماتے ہیں کہ دکھوں کو دہرانا چھوڑ دو، وقت کم ہے۔ اگر یہ کارآمد نہ ہو سکا تو زندگی ضائع ہو گئی۔

دنیا میں کوئی ایک چیز ایسی نہیں جو وقت کے پیمانوں میں بند نہ ہو۔ علوم بھی وقت کے پیمانوں سے آزاد نہیں ہیں۔ تین سال کے بچے کو دسویں جماعت کی کتاب نہیں پڑھائی جاتی۔ بچہ وقت گزارے بغیر لڑکپن میں داخل نہیں ہوتا، معین وقت گزرنے سے پہلے جوان نہیں ہوتا اور جوانی سے پہلے بڑھاپا نہیں آتا۔ ہر چیز وقت کے دائرے میں بند ہے۔ بیداری میں زندگی وقت کے پیمانوں میں گزرتی ہے،خواب میں حواس کی رفتار تیز ہونے سے اسپیس سمٹ جاتی ہے لیکن وقت بہر حال موجود رہتا ہے۔

وقت پر کام کرنے سے ذہن یکسو ہوتا ہے اور شخصیت پُراعتماد ہوجاتی ہے، ٹھہراؤ اور بردباری پیدا ہوتی ہے،لوگ ایسے شخص کی باتوں کو سنجیدگی سے سنتے ہیں اور رائے کو اہمیت دیتے ہیں کیوں کہ جو وقت کا صحیح استعمال کرتا ہے، وقت کی صفات اس کے اندر داخل ہوجاتی ہیں۔ وہ جب چاہے، وقت کو غالب کرکے فاصلہ مغلوب کرسکتا ہے اور جان لیتا ہے کہ وقت کی بیلٹ کیا ہے۔

وقت کی صفات ہیں اور ہر صفت علم ہے۔ ہمیں بامقصد زندگی گزارنے کے لئے خود احتسابی کی ضرورت ہے۔ چارٹ (جدول) بناکر معلوم کرسکتے ہیں کہ دن میں کتنا وقت کام اور کتنا آرام ہوتا ہے۔ چارٹ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ نمبر شمار، کام، دورانیہ اور اہمیت کے عنوان سے چار کالم بنائیے۔ کام کے کالم میں کام لکھئے، دورانیہ میں کام کے اوقات اور اہمیت کے کالم میں لکھئے کہ آپ نے اس کام کو اتنا وقت کس وجہ سے دیا۔ اگر ایک گھنٹا گفتگو کی ہے اور گفتگو کا کوئی مقصد نہیں تھا تو 60 منٹ ضائع ہوگئے۔ اس چارٹ پر کچھ عرصہ مشق کرنے سے زندگی میں ترتیب آئے گی ، غیر ضروری کام حذف ہوں گے اور وقت میں برکت ہوجائے گی، انشاءاللہ۔

زندگی کے آثار و احوال کا محاسبہ کرنے سے راز منکشف ہوتا ہے کہ زندگی دراصل وقت ہے، ہم پوری زندگی وقت میں گزارتے ہیں۔ بڑے بوڑھوں کا ارشاد ہے کہ وقت کی قدر کیا کرو، گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ جو وقت ہم کارآمد گزارتے ہیں ، وہ ہماری زندگی کا حاصل ہے اور جو وقت ہم ضائع کرتے ہیں، وہ ہماری زندگی میں لاحاصل عمل ہے۔ وقت کے بارے میں انسان کو علم ہوجائے تو اس کے اوپر علم کے ایسے دروازے کھل جاتے ہیں جن میں سے وہ کسی ایک دروازے میں داخل ہوکر معلوم کرلیتا ہے کہ انسان کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے کیوں آتا ہے اور نہ چاہنے کے باوجود چلا کیوں جاتا ہے۔ وقت کا علم رکھنے والا اپنی تخلیق کے راز سے واقف ہوجاتا ہے۔ (کتاب: وقت)

احمد ندیم

بلا عنوان

چڑا دو دن متواتر منڈیر پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ نہ کھاتا نہ پیتا تھا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ کبھی دو چار قدم چل کر سو جاتا۔ آپی، میں اور صائمہ اس کی حالت پر گھنٹوں افسوس کرتے اور کہتے، اے کاش! دنیا فانی نہ ہوتی۔

صائمہ اور میں دالان کے وسط میں چکنی مٹی کے زیور بنا رہے تھے۔ ہم سے چند سال بڑی میری آپی ٹوکرے کو ایک طرف کھڑا کر کے، سرے پر لمبی رسی باندھے دروازے کی اوٹ میں بیٹھی تھیں۔ ٹوکرے کے نیچے دانے بکھرے پڑے تھے۔ آپی کو چڑیا کا شکار کرنا تھا۔

میں نے مٹی کی انگوٹھی بنا کر صائمہ کو پہنائی۔ وہ ہنس دی۔ اس نے مٹی سے ہار تیار کیا جس میں نگینے کی جگہ سبز کانچ کی چوڑی کا ٹکڑا جڑ دیا اور مجھ سے بولی، یہ لو اپنی انگوٹھی کی قیمت۔

میرے کچھ کہنے سے قبل خپ کی آواز آئی۔

آپی نے چڑیا پکڑلی تھی۔ اسے دیکھنے کے لئے وہ کبھی ٹوکرے کے اِس طرف بیٹھ جاتیں کبھی اُس طرف۔ پھر ہم سے کہا، اب کیسے نکالا جائے اسے؟ ہاتھ کون ڈالے اندر! کہیں پُھر سے اڑ نہ جائے؟

میں نے کہا، صائمہ! ہاتھ ڈالو ٹوکرے کے اندر۔

وہ ناگواری سے بولی، اوہ! ہم کیوں دوسروں کا گناہ اپنے سر لیں۔ اگر مایوس چڑیا ہاتھ پر ٹھونگا لگا بیٹھی تو پہروں رونا پڑے گا۔

آپی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا، بزدل!

صائمہ نے ایک نظر مجھے دیکھ کر تیز لہجے میں آپی کو جواب دیا، میں بزدل ہوں اور تم کون ہو؟ پرندوں پر ظلم کرنے والی!

اس سے پہلے کہ بات بڑھتی، میں نے ٹوکرے میں ہاتھ ڈال کر چڑیا پکڑلی۔

صائمہ چیخ اٹھی، ارے! یہ تو ہمارا چڑا ہے۔ ہمارے باورچی خانے میں رہتا ہے۔ بھلا مانس ہے، کھلے برتنوں کے سوا کہیں چونچ نہیں مارتا۔ چھوڑ دو اسے، ہماری چڑیا بیوہ ہو جائے گی۔

ہم نے مزے سے اس کی باتیں سنیں۔ آپی نے کہا، ارادہ تھا کہ گڑیوں کے بیاہ میں اس کے گوشت سے ولیمے کی دعوت ہو گی مگر تمہاری درخواست پر چھوڑ دیتی ہوں۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی کے گھر سے چوری چھپے دانہ چگنا جرم ہے۔

چڑا یوں آنکھیں گھما رہا تھا جیسے ہماری باتیں خوب سمجھ رہا ہے۔ آپی اسے میرے ہاتھ سے چھین کر اندر بھاگیں اور دروازہ بند کر دیا۔

دھڑ دھڑ، دھڑ دھڑ ــــ ہم نے کواڑ پیٹ دیئے مگر اللہ جانے اندر چڑے پر کیا بیت رہی تھی پھر چیں چیں چوں چاں کی آوازیں آئیں، اور اس کے بعد آپی کا بلند قہقہہ ــــ ہم نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور زور سے پکارا، آپی!

دروازہ کھلا ۔ چڑے میاں کے سر پر ریشم کی ڈوری سے پھول بندھا ہوا تھا جو ننھی کھوپڑی پر کس کر باندھا گیا تھا۔ بے چینی بتا رہی تھی کہ وہ تکلیف میں ہے۔ صائمہ غم و غصے سے بولی، کتنی ظالم ہو تم!

نادان آپی نے جواب نہیں دیا اور مٹھی کھول دی۔ چڑا پُھر سے اڑا اور بیری کے درخت پر سے ہوتا ہوا دور مسجد کے میناروں کی پرلی طرف غائب ہو گیا۔ اس دن چڑے نے صائمہ کے گھر سے اپنا آشیانہ اٹھا لیا اور نہ جانے کہاں جا بسا۔ صائمہ کا خیال تھا کہ آدم کی اولاد کا ظلم دیکھ کر اس نے ویرانے میں آشیانہ بنا لیا ہو گا۔

صائمہ ہماری پڑوسن تھی۔ آپی سے ناراض ہو کر ہمارے گھر آنا چھوڑ دیا۔ دو ماہ بعد باورچی خانے سے چوں چوں کی آواز آئی۔ وہی چڑا تنکا تنکا لا کر باورچی خانے کی چھت پر گھونسلا بنانے کی کوشش میں تھا۔ رنگ نکھر گیا تھا۔ میں نے کھوپڑی پر ریشم کی ڈوری سے پہچانا۔ بھاگ کر صائمہ کو بلایا۔

وہ چڑے کا سن کر خوشی سے اڑتی ہوئی آئی۔

چڑا ڈر کر باہر نکل گیا۔ صائمہ نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا، چڑیا کو لینے گیا ہے۔ میں نے کہا، بوڑھے چڑے کے ساتھ کون چڑیا آئے گی؟ کہیں سے چڑیوں کی دادی اماں کو اٹھا لائے گا۔

صائمہ ہنس کر بولی، جسے بھی لائے، کم از کم اس کی تنہائی دور ہو جائے گی۔

غروب آفتاب سے پہلے چڑا واپس آیا تو اکیلا نہیں تھا، چڑیا ساتھ تھی۔ شبنم کے قطروں جیسی شفاف آنکھیں، سونے میں ڈھلے پنجے اور ریشم سے بنے ہوئے پَر۔ ایسے چوں چوں کرتی تھی جیسے چونچ نہیں، جل ترنگ ہو۔ دونوں کچھ دیر منڈیر پر بیٹھے پھر اندر آئے اور چھت میں شہتیروں کے آس پاس آباد ہو گئے جیسے یہ جگہ ان دونوں کے رہنے کے لئے گارا تھوپنے سے رہ گئی تھی۔

وہ دو سال ہمارے گھر میں شراکت دار رہے۔ گرمیوں میں روشن دان میں آجاتے، سردیوں میں باورچی خانے میں گھس جاتے۔ چڑا آپی سے دور رہا مگر صائمہ اور مجھ سے مانوس ہو گیا۔

ایک بار ہم نے چڑے کو پکڑ لیا اور سر پر بندھی ریشم کی ڈوری کھولنی چاہی مگر وہ دردناک انداز میں چیخ اٹھا اور ہمیں اسے چھوڑنا پڑا۔ منڈیر پر بیٹھی چڑیا

نے ہمیں گھور کر دیکھا۔ چڑا ہاتھ سے نکلتے ہی سیدھا بیگم کے پاس جا بیٹھا اور کھسر پھسر کی۔

صائمہ بولی، چڑیا کو سمجھا رہا ہے کہ بے فکر رہو، یہ ہمیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

میں نے ہنسی دباتے ہوئے پوچھا، اور چڑیا کیا کہہ رہی ہے ؟ وہ بولی، چڑیا خوف میں مبتلا اور حواس باختہ ہے۔ سمجھا رہی ہے کہ جو جنت چھوڑ کر زمین پر آجائے اس پر بھروسہ نہ کرنا۔

ہم نے جوانی میں قدم رکھا اور چڑا چڑیا کی کہانی بچپن کی یاد بن گئی۔ صائمہ کا آنا کم ہوگیا۔ ایک شام وہ آپی سے ملنے کے بہانے گھر آئی تو اس شدت کی سردی میں بھی پسینے سے شرابور تھی۔ چاند کی روشنی چہرے پر پڑی تو میں سمجھا کہ بابل اور نینوا کی کوئی شہزادی دربانوں کی نظروں سے کترا کر چور دروازے سے محبوب سے ملنے آئی ہے۔

میں نے کہا، صائمہ! وہ دن بیت گئے جب ہم مٹی کے زیور بناتے تھے، چڑیوں کے پیچھے بھاگتے تھے، رنگ برنگ تتلیاں پکڑتے تھے، نہ کوئی روکنے والا تھا نہ پوچھنے والا ، اب یہ حالت ہے کہ زہرہ خالہ تمہیں گھر سے باہر قدم رکھتا دیکھیں تو ان کے تیور بگڑ جاتے ہیں اور ابا کو تمہارا گھر سے نکلنا ناگوار گزرتا ہے۔ وہ ہمیں ملنے سے روک سکتے ہیں لیکن ہمارے جذبات پر پہرا نہیں بٹھا سکتے۔ کیا تم دور رہنا برداشت کرلوگی۔ بچپن سے ہم ساتھ ہیں۔ مانا کہ تم پریوں جیسی لگتی ہو لیکن میں تمہاری سیرت پر فریفتہ ہوں۔ مدت گزری، میں نے تمہیں مٹی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔

اور وہ ٹوٹ گئی تھی۔ صائمہ نے بات مکمل کی۔ ایسے بولی جیسے کسی نادان بچے نے سمجھے بوجھے بغیر سارنگی کے تار چھیڑ دیئے ہوں۔

میں گھبرا گیا۔

وہ بولی، تم چپ ہوگئے۔ بات یہ ہے کہ اس قسم کے حالات میں مرد سے زیادہ عورت قربانی دیتی ہے۔ وہ پنجرے میں بند چڑیا ہے، نکل نہیں سکتی۔ نکلے گی تو پَر زخمی کرلے گی اور اڑنے کے قابل نہ رہے گی، رینگے گی اور تم جانتے ہو رینگنے سے چڑیا آشیانے تک نہیں پہنچ سکتی۔

میں نے کہا، پَر تو دوبارہ بڑھ جاتے ہیں۔

اس نے برجستہ کہا، پروں کے بڑھنے کا انتظار کون کرتا ہے؟

میں نے کہا، چڑیا اور چڑا یاد ہیں جو باورچی خانے میں رہتے تھے، حادثاتِ زمانہ کا مقابلہ کرتے تھے، مصیبتیں جھیلتے تھے مگر جدا نہیں ہوئے۔ شوخ اور چنچل چڑیاں ہمارے ریشمی تاج والے چڑے کے گرد منڈلاتی تھیں مگر اس نے اپنی چڑیا کی جگہ کسی کو نہ دی۔ یہ حیوان ہے پھر ہم انسان ہو کر اتنے بے بس کیوں ہیں؟ تمہاری باتوں میں ناامیدی مجھے

مضطرب کر رہی ہے۔

چڑے چڑیا کی یاد پر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

وہ بولی، کاش ہم ان کی تقلید کے قابل ہو سکیں۔

پھر اٹھتے ہوئے بولی، اپنے کہے کا پاس رہے۔

اس کی باتوں نے کلیجہ چھلنی کر دیا۔ شک و شبے میں لپٹی ہوئی محبت کا انجام کسے معلوم نہیں۔

اور چڑے چڑیا کی سنئے ـــــ سال پہلے ہمارے گھر نیا جوڑا آیا۔ ایک صبح چڑیا گھونسلے سے نکلی تو گھبرائی ہوئی تھی۔ کچھ فاصلے تک اڑ کر فرش پر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر گردن جھکائی اور منڈیر پر جا بیٹھی۔ چڑا لمبے لمبے چکر کاٹ کر اس کے پاس آتا، چیختا ہوا فضا میں قلابازیاں کھاتا پھر نیچے آجاتا۔ گھنٹے بھر چڑیا کی یہ حالت رہی کہ کبھی فرش پر ہے تو کبھی منڈیر پر۔ کبھی اونگھ رہی ہے تو کبھی پنجے گھسیٹ رہی ہے۔ ہماری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ جب چڑیا دو ایک بار لڑکھڑائی اور ایک طرف لڑھک کر ختم ہو گئی تو چڑا اس قدر چیخا کہ امی تنگ آگئیں۔ میں نے کہا، آج اس کی چڑیا مر گئی ہے۔ رونے دیجئے، کل کلاں کو یہ بھی مر جائے گا۔ اتنا عرصہ اس کے ہمراہ گزار کر اکیلا کیسے جی سکتا ہے۔

آپی ہچکیاں لے کر رونے لگیں۔

ان دنوں صائمہ بیمار تھی۔ گرتی ہوئی صحت نے سب کو پریشان کر دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے چڑیا کے مرنے کی اطلاع کیسے دوں۔ ٹھیک اس روز خالہ زہرہ اور خالو اسے ہمارے گھر لائے اور امی سے کہا، بہن! اجازت ہو تو کچھ دن یہ آپ کے پاس رہ لے۔ کھلا صحن ہے، تازہ ہوا میں سانس لے گی تو صحت اچھی ہو جائے گی، اپنے گھر میں اس کا دم گھٹتا ہے۔ برسوں کا ساتھ ہے اس لئے آپ پر بھروسا ہے۔

میرے امی ابا کو اعتراض نہیں تھا۔ وہ اس کے لئے میری پسندیدگی سے واقف تھے۔

صائمہ کا یہ حال تھا جیسے چاند کو گہن لگ گیا ہے۔ وہ رنگ کدھر گیا۔ وہ بال کیا ہوئے۔ وہ رعنائی اور دلفریبی کیا ہوئی۔ الٰہی! کیا انسان کو اتنا حسین بنا کر ایسا بے رنگ بھی کر سکتا ہے؟ منڈیر پر بیٹھے ہوئے چڑے نے میری طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے چوں چوں کی جیسے کہہ رہا ہو کہ تم تو سیرت کے پجاری تھے۔ اب کیا ہو گیا؟

چڑیا کے مرنے کی اطلاع دی۔ اس کے سفید ہونٹ کھل گئے اور بڑی بڑی ویران آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ بولی، اللہ خیر کرے!

میں کچھ نہیں سمجھا۔ چڑیا کی قبر بنائی اور اس پر سبز رنگ کا غلاف چڑھا دیا۔

چڑا بے چارہ دو دن متواتر منڈیر پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ نہ کھاتا نہ پیتا تھا۔ دو چار قدم چل کر سو جاتا۔ آپی، میں اور صائمہ اس کی حالت پر گھنٹوں افسوس کرتے اور کہتے، اے کاش! دنیا فانی نہ ہوتی!

تیسرے دن وہ منڈیر سے اڑ کر بیری کے درخت پر جا بیٹھا۔ پھر گرتا پڑتا دوسری طرف اڑ گیا۔ پانچویں روز ہم حیران رہ گئے جب وہ منڈیر پر بیٹھا چوں چوں کر رہا تھا۔ پہلو میں نئی چڑیا پھدک رہی تھی۔ صائمہ کی آنکھیں پانی ہو گئیں۔ آپی چہرے کو دوپٹے سے چھپائے اندر چلی گئیں۔

میں نے کہا، چڑا کتنا بے وفا نکلا۔

صائمہ بولی، اللہ خیر کرے!

میں کچھ نہیں سمجھا۔

صائمہ کی حالت دن بدن نازک ہو رہی تھی۔ رنگ خوف ناک حد تک سفید ہو گیا تھا۔ زندگی جیسے اس کی پتلیوں اور سوکھے پپوٹوں میں سمٹ آئی تھی۔ بے رونق بال، ابھری ہوئی پیشانی، دھنسی ہوئی آنکھیں ـــ جیسے جنگل کا پھول جسے آندھی نے گرد وغبار کی چادر پہنا دی ہو۔ جی دہل جاتا اور میں رنگین آغاز کا یہ انجام دیکھ کر بوکھلا اٹھتا۔

ایک روز جب گھر والے کام میں مصروف تھے، صائمہ نے اشارے سے بلایا، میں پنجر نما وجود کے قریب گیا۔ اس نے کہا، چڑے چڑیا کی مثال پیش کرتے ہوئے شاید انجام تمہاری نظروں میں نہیں تھا۔ چڑیا چل بسی۔ چڑا دوسری چڑیا لے آیا۔ دنیا کا یہ قانون قدیم ہے۔ کون مرنے والے کے لئے جی ہلکان کرے۔ تم میری حالت دیکھ کر روتے ہو۔ میں تمہیں پریشان دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چڑے کی طرح منڈیر پر دو ایک بار اونگھو اور پھر ـــ!

میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں اٹھ کر جانے لگا۔

وہ بولی، کہاں چلے پوری بات تو سن لو۔

نظریں ملائے بغیر پوچھا، کہو۔

کچھ نہیں۔ تم سب سمجھتے ہو۔

میری آنکھوں سے آنسوؤں کا طوفان ابل پڑا۔

کچھ دنوں بعد صائمہ کو اس کے والدین گھر لے گئے کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے بزرگوں کے گھر پر دم توڑے۔ میں یہ منظر دیکھنے سے بچنے کے لئے چار مہینوں کے لئے چاچا کے پاس لاہور آ گیا۔ یہاں رمیزہ سے ملاقات ہوئی اور زندگی کے نئے باب کا آغاز ہوا۔ معلوم تھا کہ صائمہ نے میرے آنے کے دوسرے دن دم توڑ دیا ہو گا۔ گھر والوں سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی نہ انہوں نے کچھ بتایا۔ کچھ دن ملول رہا پھر سوچا کہ زندگی جینے کے لئے اچھا وقت کٹ گیا۔ وہ گھڑیاں گزر گئیں، اب مٹھی بھر خاک کے لئے باقی زندگی برباد کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟

جس روز گھر واپس جانا تھا، معلوم ہوا کہ اماں ابا نے رمیزہ سے میری بات طے کر دی ہے اور ہونے والی بھو کے لئے سونے کا ہار بھیجا ہے۔ میرا دل خوشی سے آباد ہو گیا۔

چار مہینے بعد گھر لوٹا تو جو خبر سننے کو ملی، پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ میرے جانے کے بعد صائمہ کی صحت بحال ہونے لگی اور اب وہ بھلی چنگی تھی۔ گھر کے کام کاج کرتی تھی البتہ ہمارے ہاں آنا جانا کم ہو گیا تھا۔ گھر والوں نے صحت یابی کی خبر دی نہ میں نے پوچھا۔ شاید انہیں میری رمیزہ میں دلچسپی کی خبر مل گئی تھی۔

رات کو پلنگ پر لیٹا تو ندامت نے آگھیرا اور پرانی باتیں سماعت میں گونجنے لگیں۔

صائمہ کہتی تھی:

چڑیا کے آنے سے چڑے کی تنہائی دور ہو گی۔

پروں کے بڑھنے کا انتظار کون کرتا ہے۔

چڑیا چل بسی تو چڑا دوسری چڑیا لے آیا۔

کون مرنے والے کے لئے جی ہلکان کرے۔

اللہ خیر کرے!

اپنے کہے کا پاس رہے۔

صبح امی نے خبر دی کہ مبارک ہو! تمہاری شادی کی تاریخ طے کر دی گئی ہے۔

میں نے بے ساختہ کہا—— رمیزہ سے شادی نہیں کروں گا۔ میری شادی صائمہ سے ہو گی۔

محلے میں میری گستاخی کے چرچے ہوئے۔

اماں ابا نے خاموشی اختیار کر لی۔

کسی نے خبر صائمہ تک پہنچا دی۔

شام کو دالان میں بیٹھا تھا کہ اس کی سہیلی پیغام لائی۔ بتایا—— صائمہ کہہ رہی ہے وہ عمر بھر کنواری رہنا پسند کرے گی لیکن تمہارے جیسے بے وفا سے شادی نہیں کرے گی۔ چڑیا کی لاش دیکھ کر چڑا دوسری چڑیا لایا تھا، تم نے تو بن دیکھے موت کا یقین کر لیا اور نیا آشیانہ بنا بیٹھے۔ بتاؤ تم اچھے یا وہ چڑا؟

دوست پیغام دے کر چلی گئی۔

صحن میں بڑھتے ہوئے اندھیرے میں سایہ سا فضا میں تیرتا ہوا آیا اور آہستہ سے کہا،

"مایوس چڑیا ہاتھ پر ٹھونگا لگا بیٹھی تو پھر وں رونا پڑے گا۔"

میرے پیروں میں جان نہیں تھی۔ جس دالان سے صائمہ اور میرا افسانہ شروع ہوا تھا، آج وہیں پر اس کا اختتام ہو گیا۔

بیٹے نے کہا، بابا! تجربات سے میں نے سیکھا ہے کہ کسی سے بحث کرنے سے پہلے خود سے پوچھو کہ کیا وہ شخص ذہنی طور پر اتنا بالغ ہے کہ اختلافِ رائے کو قبول کر لے۔ اگر اس میں پختگی نہیں اور وہ اختلافِ رائے کے مفہوم سے نابلد ہے تو بحث کرنے کا فائدہ نہیں۔ باپ نے کہا، اچھی بات ہے۔ اگر ایسا کوئی مل جائے جو اختلافِ رائے کو اہمیت دیتا ہو تو اس سے بحث کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ کیا میرے اندر اتنی پختگی ہے کہ میں اختلاف برداشت کر سکوں؟ ذہن پختہ نہ ہو تو بحث کرنے کا فائدہ نہیں۔ **قارئین! آپ کیا سمجھے——؟**

بی بی انورادھا

میں ہی نظر اور میں ہی منظر تھا

کچھ لوگ محبوب کا نام ساحل پر لکھ کر چلے جاتے۔ لہر آتی اور نام مٹا کر واپس ہو جاتی۔ محبوب فانی تھا، اس لئے محبت بھی فانی تھی۔ محبوب حقیقی ہوتا تو لہر احترام سے گزر جاتی اور نام باقی رہتا۔

میں ـــــ ریت کا ذرّہ سمندر کی تہ میں گوشہ نشین تھا۔ تہ میں گہری خاموشی تھی، خاموشی میں سکون تھا اور مجھے سکون سے محبت تھی۔ گہرائی میں ہر شے ساکن محسوس ہوتی ہے جیسے بنیاد میں مدغم ہو کر قرار آ گیا ہو۔ سمندر کا پانی سرد، تہ باہر کی روشنی سے دور اور موجیں طبق در طبق راز تھیں۔

سمندر رنگین دنیا ہے جس میں ہریالی ہے، خوش رنگ پھول، پودے اور جڑی بوٹیاں ہیں، ٹھنڈے میٹھے، اور گرم پانی کے چشمے ہیں، آتش فشاں ہیں، معدنیات سے بھرپور بلند و بالا پہاڑ ہیں، دلکش نقوش رکھنے والی خوش مزاج ، شرمیلی، غضب ناک اور معتدل مزاج چھوٹی بڑی رنگین مچھلیاں اور ہزاروں قسم کی مخلوقات ہیں۔ تنہائی کا یہاں گزر نہیں، لہریں باتیں کرتی ہیں۔

میرے لئے وہ نظارہ دل نشین تھا جب مچھلیوں کے غول ہنستے کھیلتے گزرتے تھے۔ میں سمندر کی زمین پر پودوں میں چھپا ہوا بے شمار ذرّوں میں سے ایک ذرّہ تھا جو کبھی قیام کرتا اور کبھی لہروں کے ساتھ سفر میں رہتا تھا۔ جی ہاں! میں نے موجوں کے سنگ سفر کیا ہے، گہرائی میں غوطہ زن ہوا ہوں اور تمام طبقات کی سیر کی ہے۔ وہ وقت بھی تھا جب زندگی میں ہلچل نہیں تھی اور وہ وقت بھی دیکھا جب لہروں نے مجھے اچھال کر نشیب و فراز سے گزارا۔ گہرے راز اور گراں قدر خزانوں کا مشاہدہ کیا۔ بہت کچھ سیکھا اور کسی حد تک موجوں سے ہم آہنگ ہو گیا۔ میں نے جانا کہ پانی میں رہ کر پانی کا مزاج اختیار نہ کریں تو پانی قبول نہیں کرتا۔

سمندر کو معلوم تھا کہ زمین کے 75 فی صد حصے پر اس کا بسیرا ہے پھر بھی اس نے 25 فی صد خشکی پر قبضہ نہیں کیا۔ اسے نگلا نہیں اور نہ طاقت کے مظاہرے کی کوشش کی۔ میں نے عجز کی یہ صفت

سمندر سے سیکھی۔ اس نے ہر طرف سے خشکی کو گھیرا ہوا تھا، کنارے خشکی سے ملتے تھے مگر وہ اپنی حدود میں قائم رہا۔

سمندر کو ماں کی طرح مہربان پایا۔ انتہائی چھوٹی آبی مخلوق ہو یا زمین پر سب سے بڑا ممالیہ وہیل، سمندر اندر موجود حیات کی نشوونما کرتا ہے۔ کوئی آبی دنیا دریافت کرنا چاہے تو موجوں کی شادمانی دیدنی ہوتی ہے اور پانی راستہ بناتا ہے۔ سمندر میں پہلی بار آدم کو دیکھا تو دل نے بے ساختہ کہا، یہ اللہ کی حسین مخلوق ہے۔ جاننے کا تجسس بڑھا اور ساتھ رہنے کی خواہش گہری ہوگئی۔ پانی میں صدیاں گزاری تھیں، اب خشکی کی دنیا دیکھنا چاہتا تھا۔

سمندر سے پوچھا، تم 75 فی صد پر مقیم ہو۔ خشکی میں داخل کیوں نہیں ہوتے؟

سمندر نے جواب دینے سے پہلے شرارت سے مجھے ایک دو لہر دور پھینکا اور واپس آغوش میں لیتے ہوئے کہا، خشکی نے میرے وجود سے جنم لیا ہے۔ جہاں آج وہ ہے، کل میں تھا۔ پھر اللہ کے حکم سے میں سمٹ گیا اور کچھ حصہ خالی چھوڑ دیا۔ آدمی یہ بھول گیا کہ زمین نے میرے بطن سے جنم لیا ہے، میں بھی زمین ہوں، اس نے صرف خشک حصے کو زمین کہنا شروع کر دیا۔ بتاؤ جو میرے وجود کا حصہ ہو، میں اس سے متصادم کیسے ہو سکتا ہوں؟ اور کون کہتا ہے کہ میں زمین پر نہیں ہوں؟ دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ میں خشکی اور پانی دونوں جگہ پر ہوں۔ ہر شے پانی سے بنی ہے۔ نگاہ اٹھا کر بادل کو دیکھو۔ اس کے اندر میرا خون ہے۔ وہ میرے قطروں سے مل کر جما ہے۔ آسمان سے پانی کو برستے دیکھا ہے؟ وہ بھی میں ہوں۔ زمین اور فضا میں جہاں کہیں پانی ہے، سب گھوم پھر کر میرے پاس آتے ہیں، کیوں کہ اللہ نے میرے وجود کو ان کے لئے وسیع کر دیا ہے۔ میرے کناروں پر ناریل کے درخت ہیں جو مجھ سے سیراب ہوتے ہیں اور کیسا میٹھا پھل دیتے ہیں۔ زمین میں پانی کی سب سے میٹھی حالت پھلوں میں اور سب سے نرم و ملائم صورت پھولوں میں ہے۔ اور کیا تم نے اللہ تعالیٰ کی احسن تخلیق انسان کو نہیں دیکھا؟ اس کا جسم تقریباً 70 فی صد پانی ہے۔ پہاڑوں سے لے کر بادلوں تک کوئی ایسی چیز نہیں، جس کے اندر میں نہیں ہوں۔ سو خشکی سے تصادم، اپنے دوسرے رخ سے متصادم ہونا ہے۔

سمندر کی سب کے لئے محبت دیکھ کر ایسا لگا کہ زمین پر جو کچھ ہے، سمندر کی حیثیت ان کے لئے رحمِ مادر کی ہے۔ ہمت مجتمع کر کے کہا، آپ نے اتنا عرصہ میری میزبانی کی اور کبھی شفقت سے محروم

نہیں رکھا۔ میں خشکی پر زندگی کے رنگ اور اللہ کی احسن تخلیق انسان کو قریب سے دیکھنا چاہتا ہوں۔

خواہش پر سمندر مسکرایا تو اس کے رخساروں کا ابھار، موجوں کے ابھار سے ظاہر ہوا۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے میں تمہیں دو میں تقسیم کر دیتا ہوں۔ ایک حصہ نایاب مخلوق صدف کے بطن میں اور دوسرا اپنے کنارے پر رکھوں گا۔ تم ارتقا سے گزر کر اپنا تعارف حاصل کروگے۔ پھر معین وقت کے بعد واپس میری آغوش میں آجاؤ گے۔

اس سے پہلے کہ میں سمندر کو الوداع کہتا، خود کو دو میں تقسیم ہوتا دیکھا۔ ایک حصے کو موجیں ساحل پر لے گئیں اور دوسرا حصہ بارش کا قطرہ بن کر صدف کے بطن میں منتقل ہوگیا۔

نئے ماحول میں آکر دل پُر جوش اور نگاہ منتظر تھی کہ دیکھے زندگی خشکی پر کیسے سانس لیتی ہے۔ میں ساحل پر عیاں اور صدف کے شکم میں نہاں، دونوں جگہ ماہیتِ قلب سے گزر رہا تھا۔

خشکی پر پہلا خوش کُن تجربہ سورج کی شعاعوں سے براہِ راست متعارف ہونا تھا۔ لمس منتقل ہونے سے میرے لئے اسے جاننا آسان ہوگیا۔ لمس ہستی کا عکس ہوتا ہے اور عکس میں صفات موجود ہوتی ہیں۔ ذرّات میں تپش کی چمک دور سے نظر آتی تھی۔ لوگ شام کو ساحل کا رخ کرتے۔ ہجوم میں کئی قدم مجھ پر سے گزر جاتے۔ دن بھر سورج کی تپش سے سلگنے کے بعد انسانوں کے قدم ٹکور (سینکنے) کا کام کرتے تھے۔ میں خود کو ننھا ذرّہ سمجھتا تھا، ساحل پر آکر اپنی سکت کا اندازہ ہوا۔

یہ محبت کرنے والے لوگ تھے۔ میرے ساتھ کھیلتے، مجھ پر محلات تعمیر کرتے اور ان میں سے کچھ ایسے دکھی دل تھے جن کے آنسو مجھ میں جذب ہو جاتے۔ آنسو بہانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا جب کہ ان کے آنسو جذب کر کے میں بے قرار ہو جاتا تھا۔ کچھ لوگ محبوب کا نام ساحل پر لکھ کر چلے جاتے۔ لہر آتی اور نام مٹا کر واپس ہو جاتی۔ محبوب فانی تھا، اس لئے محبت بھی فانی تھی۔ محبوب حقیقی ہوتا تو لہر احترام سے گزر جاتی اور نام باقی رہتا۔

جب ساحل پر گھما گھمی میں دل لگ گیا تو ایک صبح کوئی قریب آیا اور میرے ساتھیوں سمیت مجھے مٹھی میں بھر کر تھیلے میں ڈال دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں سے جانے کا وقت آگیا ہے۔ پھر وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا نہ جانے کہاں چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں تھیلی سے نکل کر سخت برتن سے ٹکرایا۔ یہاں میرے علاوہ دوسرے عناصر بھی تھے۔ کیا ہونے والا تھا، مجھے نہیں پتہ۔

چند لمحوں بعد میرا جسم دہک اٹھا جیسے آگ پر رکھ دیا ہو۔ حدت میں شدت سے میں بلبلانے لگا۔ جسم پگھل کر پانی ہو گیا مگر حیرت ہے کہ اپنے ہونے کا احساس باقی رہا۔ میں کیسے زندہ ہوں؟ کیا جسم مجھ سے الگ ہے اور میں کوئی اور ہوں؟

آگ اب تک دہک رہی تھی اور میں نے جل کر نہ جانے کیا صورت اختیار کر لی تھی۔ یقین ہو گیا کہ شکل بدل گئی ہے اور میں ریت کا ذرّہ نہیں رہا۔

پھر وہی ہاتھ قریب آیا اور برتن اٹھا کر دوسری جگہ پر رکھ دیا۔ دوسرے ذرّات بھی پگھل کر محلول بن گئے تھے۔ آہستہ آہستہ درجہ ٔ حرارت کم ہوا اور محلول جم گیا۔ دیکھا کہ میں چمکتی ہوئی شفاف سل ہوں جس پر مزید تہیں چڑھائی جا رہی ہیں۔ تھکن سے چور ہو کر میں نے آنکھیں موند لیں۔

آنکھ کھلی تو بھٹی سے نکل کر دیوار کی زینت بن چکا تھا اور آس پاس ہر شے کو اندر میں دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی خود کو میرے اندر دیکھ رہے تھے۔ پتہ چلا کہ میرا نیا نام آئینہ ہے۔ بھٹی میں جلنے کے بعد پک کر اس قابل ہو گیا تھا کہ میں سب کو، اور سب میرے اندر خود کو دیکھ سکیں۔ پھر کوئی آیا اور مجھے خرید کر گھر کی ایک دیوار پر سجا دیا۔

آئینہ بن کر میری اہمیت بڑھ گئی۔ اب میرا کام لوگوں کو دیکھنا، اور جو دیکھا، وہ انہیں دکھانا تھا۔ ان کے احساسات کی تصویر بن گیا۔ وہ مجھ سے باتیں کر کے سمجھتے تھے کہ خود سے باتیں کر رہے ہیں۔ اس طرح نوعِ آدم سے دوستی کرنے کا موقع ملا۔ وقت کی لکیریں ان کے خدوخال جس ترتیب سے بدل رہی تھیں، انہیں دکھاتا تھا۔

میں لوگوں کی نظر میں آئینہ تھا مگر اپنے لئے ریت کا ذرّہ، جس نے نوعِ آدم کے لئے اپنی خدمات وقف کر دی تھیں۔ یہ میرے اس رخ کی کہانی ہے جسے سمندر نے ساحل پر منتقل کیا تھا۔

میرا دوسرا رخ سیپ میں خاموشی سے ارتقا کے مراحل سے گزرتا رہا۔ پھر کسی نے مجھے سیپ سے نکالا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا کیوں کہ ذرّہ قطرے سے انمول موتی بن گیا تھا۔ جس کیڑے کے خول میں بند تھا، مجھے موتی بنانے کے لئے اس نے جان قربان کر دی تھی۔

میں ہیرے جواہرات کی دکان پر سجا۔ محبت کے اظہار کے لئے میرا انتخاب ہوا۔ ایک خوبرو جوان نے خریدا اور ہار میں جڑوا کر حسین خاتون کو تحفے میں دیا۔ خاتون نے ہار گلے میں پہنا۔ موتی میں چمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ خود کو دیکھنے کے لئے وہ آئینے کے سامنے آئی۔

خاتون نے جو دیکھا سو دیکھا ــــ میں نے دیکھا کہ آئینہ بھی میں ہوں، موتی بھی میں ہوں اور ذرّہ بھی میں ہی ہوں۔ تصویر بھی میں تھا اور تصویر منعکس کرنے والا بھی۔ میں ہی نظر اور میں ہی منظر تھا۔

میں ــــ جس نے سفرِ زیست میں خود کو ریت کا ذرّہ سمجھا، دراصل روح ہوں جو ہر شے میں ہے اور ہر شے کو دیکھ رہی ہے۔ ریت کا ذرّہ لباس ہے جو پگھل کر کہیں آئینہ بنا اور کہیں موتی بننے کے لئے بارش کا قطرہ۔ میں زندگی کی اسکرین کے سامنے کھڑا ہوں اور ساتھ ہی جسم کو آئینہ اور آئینے کو جسم دکھا رہا ہوں۔ ریت کا ذرّہ پانی کے ساتھ مل کر کیسی کیسی صورتوں میں ڈھل گیا تھا۔ ریت سے بننے والے قالب ایک روز بکھرتے ہیں اور ذرّات میں تبدیل ہو کر اصل کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

کئی برس گزر گئے۔ ایک روز آئینہ چکنا چور ہو کر مٹی میں ملا اور موتی پگھل گیا۔ تیز ہوا چلی اور مٹی کو اڑاتے ہوئے ساحل کی طرف لے گئی۔ سمندر دامن پھیلائے مجھے آغوش میں لینے کا منتظر تھا۔ اس طرح ایک دفعہ پھر ذرّے نے سمندر کی تہ کو مسکن بنالیا۔ جیسے ہی میں نے غوطہ لگایا، دیکھا کہ ایک اور قطرہ سیپ میں داخل ہو رہا ہے......

روحانی کلاس میں لیکچر کے اختتام پر ایک طالب علم نے پوچھا، سر! آپ جو سمجھاتے ہیں، وہ اس وقت سمجھ میں آجاتا ہے مگر بعد میں ذہن خالی ہوتا ہے جیسے آپ نے کچھ پڑھایا نہ میں نے کچھ سمجھا۔

استاد نے پوچھا، کیا سمجھ میں نہیں آیا؟

طالب علم نے کہا، پڑھنے کے بعد ذہن خالی کیوں ہو جاتا ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ روحانی تعلیمات چند سطروں میں بیان کر دیں اور میں انہیں دہرا کر ازبر کر لوں؟

سوال سن کر دوسرے طالب علم ہنسنے لگے۔

کسی طالب علم نے کہا، علم چند سطروں میں کیسے بیان ہو سکتا ہے؟ اور اگر بیان ہو جائے تو جو بات اتنے سالوں میں سمجھ میں نہیں آئی، چند سطریں سن کر کیسے سمجھ میں آئے گی؟

لڑکے نے ساتھی طالب علم کی بات نظر انداز کر کے استاد کی طرف دیکھا۔

استاد مسکرائے اور فرمایا، ہر چیز تغیر پذیر ہے۔

قارئین ــــ مخلوق ایک حالت میں قائم نہیں، گھٹتی، بڑھتی اور گھٹتی ہے۔ جو فرد اس حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے، وہ تغیر کے مایا جال سے آزاد ہو جاتا ہے۔

محمد عدنان خان

پورب کے ہم زاد

رنگ و چمن، عروج وزوال، عشق و مستی اور فنا وبقا کے رنگوں سے معمور صدیوں پر محیط داستان جس کی مکانیت تبت کی فلک بوس چوٹیوں سے لے کر ٹیکسلا کی سرسبز وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

ردا کا میلان ماورائی علوم کی طرف تھا۔ اس نے پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے لئے ٹیکسلا کے آثارِ قدیمہ کا انتخاب کیا جہاں صدیوں پرانی داستان صفحۂ قرطاس پر ظاہر ہونے کی منتظر تھی۔ ٹیکسلا میں صدیوں پرانے کشان دورِ حکومت کا شہزادہ ملا جو اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ردا کو شہزادے سے دور رکھنے کے لئے مکروہ صورت بوڑھا بجر ولال سامنے آیا اور ردا کی پریشانیوں کا آغاز ہوا۔ نیلم کے توسط ردا کی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ شہزادے اور اس کے ساتھیوں کے ہم زاد کو شیطانی چیلوں سے آزاد کروانے کے لئے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔ ردا ملاقات کے بعد گھر جارہی تھی کہ راستے میں حادثہ پیش آیا۔ نیلم کو کم چوٹیں آئیں لیکن ردا کوما میں چلی گئی۔ اسپتال میں اس کے اندر سے روشنی کا پرت نکلا اور ماضی میں سفر کرتے ہوئے ہزاروں سال پہلے کے تبت میں لے گیا۔ یہاں ایک پہاڑ پر بنی عبادت گاہ مسکن قرار پائی۔ ردا سے پہلے عبادت گاہ میں بزرگ خاتون رہتی تھیں جو شہزادے کے علاج کے لئے محل گئی ہوئی تھیں۔ علاقے میں شیطانی قوتوں کو ردا کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے مشکلات کھڑی کیں لیکن قدرت ردا کی حفاظت کررہی تھی۔ شہزادہ صحت یاب ہوا اور بزرگ ماں محل سے لوٹ آئیں۔ شہزادہ ان کی تلاش میں پہاڑ کی چوٹی پر بنی عبادت گاہ پہنچا۔۔۔۔ وہ وہاں سے جاچکی تھیں۔

بزرگ خاتون کے جاتے ہی لچھاوی اور اس کے بیٹے دندان نے عبادت گاہ سے منسلک لوگوں کو ایک بار پھر پریشان کرنا شروع کردیا تھا۔ جوبی پہاڑ جہاں پر عبادت گاہ تھی، اس کے اطراف میں غیر معمولی سرگرمی دیکھ کر سانپوں کا بادشاہ سرپ ککولا ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔

بی بی جی! پچھلے چند دنوں سے جوبی پہاڑ کے اطراف میں ایسے سانپ دیکھے گئے ہیں جنہیں شیاطین سواری کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ باغیانہ فطرت کی وجہ سے ہمارے آباؤ اجداد نے صدیوں پہلے انہیں تمام قبائل سے خارج کردیا تھا۔ شیاطین کی صحبت نے انہیں زہریلا، خودسر اور وحشی بنادیا

ہے۔ ان کے قد کاٹھ ہم سے بڑے ہیں اور استدراج کے زیر اثر طاقت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ وہ مسلسل ہم پر حملہ کرکے آہستہ آہستہ عبادت گاہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کا مقصد کیا ہے، کوشش کے باوجود ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہاں! اتنا اندازہ ہوا ہے کہ ان کا نشانہ عبادت گاہ ہے۔ کوئی بہت منظم انداز سے انہیں استعمال کر رہا ہے۔ یہاں آتے ہوئے میں نے آپ کے خادم سرپ پندورا (ناگ) کو جوبی پہاڑی کے نزدیک واقع گاؤں کی طرف تیزی سے رینگتے ہوئے دیکھا تو مدد کے لئے راج کمار بھیم سارا کو اس کے پیچھے روانہ کر دیا۔ بی بی جی! کچھ خبر ہے کہ کیا ہو رہا ہے؟

شاہ سرپ! آپ کا اندازہ اور تشویش درست ہے۔ کچھ لوگ ہیں جنہیں عبادت گاہ اور اس سے منسلک لوگوں کو نقصان پہنچا کر خوشی ملتی ہے۔ میری اجازت کے بغیر جا کر سرپ پندورا نے خود کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔

بی بی جی! وہ آپ کا خادم ہے۔ کوئی آپ کو نقصان پہنچائے تو کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ ہم نے اسے جو ذمہ داری دی، اس نے پوری کی ہے۔ آپ مطمئن رہیں، بھیم سارا اس کے ساتھ ہے۔

شاہ سرپ! آپ لچھاوی کو نہیں جانتے۔ وہ شاہی کاہنہ اور شیطان کی پجاری ہے اور ان واقعات کے پیچھے ہے۔ اس کا اصل نشانہ بزرگ خاتون ہیں۔

سرپ ککولا کے چہرے پر تشویش گہری ہوگئی۔ اس علاقے میں انسانوں کے علاوہ حیوانات، چرند پرند سب بزرگ خاتون کا احترام کرتے تھے۔

شاہ سرپ کے جسم سے پرچھائیاں علیحدہ ہو کر ایک ایک کرکے دیو قامت اژدھے میں تبدیل ہو کر تیزی سے حجرے سے باہر نکلتی گئیں۔ ان میں سے کئی اژدھوں کا رخ رتن ناتھ کے گھر کی طرف تھا جب کہ کچھ عبادت گاہ کے اطراف میں پھیل گئے۔ یہ عمل چند سیکنڈ میں مکمل ہوا۔

شاہ سرپ ککولا نے پوچھا، بی بی جی! کیا بادشاہ کڈ فیزز کو اس معاملے کا علم ہے؟

میں نے کہا، عبادت گاہ سے لوگوں میں خیر بانٹنے کے کام کئے جاتے ہیں۔ بزرگ خاتون کی کوشش اور دعاؤں کے طفیل اللہ نے شہزادے کی جان بچائی۔ پھر بادشاہ شیطان صفت لوگوں کا ساتھ کیسے دے سکتا ہے؟ یقیناً وہ لاعلم ہے۔ یہ دشمنی کی طویل داستان ہے جس کا نشانہ بزرگ خاتون ہیں۔ لچھاوی انہیں نقصان پہنچانے میں ہمیشہ ناکام ہوئی ہے اور شکست کو انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔

گہری سوچ میں گم شاہ سرپ نے پوچھا، نقصان پہنچانے کی کوئی وجہ ہوگی؟ لچھاوی کی دشمنی کا آغاز کہاں سے ہوا؟

شاہ سرپ! یہی تو میں بھی جاننا چاہتی ہوں۔

بی بی جی! ہم نے شیطانی سانپوں کے حملوں کے

پیشِ نظر جوبی پہاڑ کو عارضی طور پر خالی کر دیا ہے مگر آپ لوگوں کی حفاظت کے لئے اپنے ساتھ مقابلہ کرنے والے سانپوں کی بڑی تعداد کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔

بہت شکریہ شاہ سرپ! اللہ آپ کی حفاظت کرے۔ آپ لوگ خود کو مشکل میں نہ ڈالیں اور ہم پر زبردستی مسلط کی گئی لڑائی سے دور رہیں ورنہ لچھاوی کے دشمنوں کی فہرست میں آپ کے نام کا اضافہ ہو جائے گا۔ اللہ کی مرضی کے بغیر پتّا نہیں ہلتا۔ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں کوئی حکمت ہے۔ عبادت گاہ لوگوں کی خدمت کی غرض سے بنائی گئی ہے۔ اس کی حفاظت غیب سے ہوگی۔

بی بی جی! عبادت گاہ سے وابستہ لوگ ہمیشہ سے یہاں کے باسیوں کے خیر خواہ رہے ہیں۔ وہ ہر نوع کی مدد کرتے ہیں۔ آپ نے ہماری مدد کی تھی اس لئے ہماری سلطنت کی آپ سے خاص وابستگی ہے۔ ہم آپ کو اپنا خیر خواہ اور بہترین دوست سمجھتے ہیں اور دوستی کے تقاضوں سے خوب واقف ہیں۔ دوستی بے لوث اور بے غرض ہوتی ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

میرے سامنے آدم زاد کے روپ میں موجود شاہ سرپ ککولا کا تعلق حیوانات کی دنیا سے تھا۔ وہ دوستی کے فلسفے سے واقف تھے۔ ان کے خلوص نے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

اتنے میں باہر سے شور کی آواز سنائی دی۔ نظر دروازے کی سمت اٹھی تو دیکھا کہ سرپ پندورا کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ لہراتے بل کھاتے ہوئے اس نے پہلے شاہ سرپ ککولا کے اطراف تعظیم سے چکر لگایا، سر کئی مرتبہ زمین پر پٹخا اور بل کھاتے ہوئے عصا پر چڑھ گیا۔

اس کے ساتھ ہی سرپ ککولا کے دو ہم شکل مہتر کو گھسیٹتے ہوئے داخل ہوئے۔ راج کمار بھیم سارا دیو ہیکل اژدھے کی صورت میں مہتر کے جسم سے لپٹا ہوا تھا اور اس کا منہ مہتر کے سر کے عین اوپر تھا۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ مہتر پر نزع کی سی کیفیت طاری تھی۔ عصا میرے ہاتھ میں تھا۔ اس میں ارتعاش ہوا۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔

اتنے میں بزرگ خاتون کی آواز گونجی:

"ہے بی بی! مہتر کے سر میں کیل ہے، اپنے سیدھے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ لے اور اس کے سیدھے ہاتھ سے نچ کر رہ!"

میں آگے بڑھی۔ سرپ ککولا کے ہم شکلوں نے مہتر کو گھٹنوں کے بل جھکا دیا۔ اس دوران بھیم سارا کی گرفت اس پر کچھ ڈھیلی ہوگئی۔ جیسے ہی مجھے اس کے سر میں کیل نظر آئی، سیدھے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچ لی۔ مہتر کی بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ وہ اتنی شدت سے مچلا کہ اس کا ہاتھ آزاد ہو کر میرے سیدھے ہاتھ پر پڑا اور کیل میرے ہاتھ سے چھوٹ

گئی۔ مہتر کو موقع ملا، اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس کے ساتھ ہی منظر بدل گیا۔

جلد بازی میں غلطی کر بیٹھی تھی۔ سامنے طویل سرنگ تھی جس میں روشنی سے بنے دو وجود مہتر کو پکڑے تیزی سے پرواز کر رہے تھے اور میں ان کے پیچھے تھی۔ سرنگ کا دہانہ تاریکی میں سفید نقطے کی مانند چمک رہا تھا۔

طویل مگر مختصر سفر کے اختتام پر سرنگ غائب ہو گئی اور ہم درختوں سے عاری غیر ہموار سرسبز میدان میں موجود تھے۔ لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ سب خاموش اور روبوٹ کی مانند اپنی باری آنے پر آگے بڑھ رہے تھے۔ مہتر مجھ سے آگے تھا۔ اس کی حالت اب تک ابتر تھی۔ چند ایک کے سوا باقی پریشان اور بے چین تھے۔

آگے میز تھی جس کے دوسری طرف دو روشن چہرہ وجود بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ریکارڈ دیکھ کر سب کو ان کا ٹھکانا بتا رہے تھے۔ مہتر ان کی میز تک پہنچا۔ اپنا ریکارڈ دیکھ کر اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ واضح تھا کہ ٹھکانا کہاں ہے۔ اسے روانہ کر دیا گیا۔

میری باری آئی۔ ریکارڈ دیکھنے والوں نے گہری نظر سے میری جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔ اسکینر میری جانب کیا گیا تو بیپ کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں سے ایک نے کہا، آپ جہاں سے آئی ہیں، ابھی آپ کا وقت وہاں باقی ہے اس لئے واپس جانا ہو گا۔

یہ کہتے ہی وہ لوگ حاضر ہوئے جو مہتر کو سرنگ کے ذریعے یہاں تک لائے تھے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ مہتر نامی فرد طویل عرصہ پہلے مر چکا تھا۔ تدفین کے وقت اس کا ہمزاد فرار ہو گیا، اس کی حوالگی میں خاتون کا اہم کردار ہے۔ ہم ان کو نہیں لائے، یہ غیر مادی وجود کے ساتھ خود یہاں پہنچی ہیں۔ وضاحت سے مطمئن ہونے کے بعد انہیں جانے کا اشارہ کیا گیا اور وہ غائب ہو گئے۔

ریکارڈ دیکھنے والوں نے کہا، آپ کا آنا لکھا تھا لیکن نام ان لوگوں میں نہیں ہے جن کو یہاں مستقل رہائش ملی ہے۔ آپ کو فوراً واپس جانا ہو گا کیوں کہ جہاں سے آئی ہیں، وہاں آپ کا جسم بے حرکت ہے، واپس نہیں گئیں تو مسئلہ ہو جائے گا۔

میں نے کہا، یہاں تک آگئی ہوں تو مختصر سیر کئے بغیر واپس نہیں جاؤں گی۔

اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، ایسا کیجئے مہمانوں والے راستے سے تشریف لائیے۔ یہ سرزمین آپ کو خوش آمدید کہے گی۔ یہ کہتے ہی اس نے فضا میں اپنے خوب صورت گلابی مائل سفید ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ لکھا تو دو حسین و جمیل معاونین جن کے چہروں پر شیر خوار بچوں جیسی معصومیت تھی، حاضر ہوئے۔ روشنی سے بنے اجسام اور آنکھوں

میں بلا کی چمک۔ ڈھیلے حرکت کرتے تو رنگ برنگ جھلملاتے ستاروں جیسا تاثر پیدا ہوتا۔

وہ ملکوتی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھے اور میرے دائیں بائیں کھڑے ہوئے پھر مجھے ساتھ لے کر اوپر کو اٹھ گئے۔

ان کی پرواز میں سرور اور مستی تھی۔ ہم دوسرے علاقے میں داخل ہوئے جہاں دیکھنے میں ہر چیز زمین جیسی تھی مگر زمین سے کئی گنا لطیف۔ سمندر کا پانی معمولی نمکین، دھوپ کی تمازت میں راحت، ہلکے سرمئی اور ارغوانی بادلوں نے عجب سماں پیش کیا۔ بادل سورج کے آگے آتا تو فضا پر صبح کا گمان ہوتا۔

میں جہاں رکنا چاہتی، معاونین رک جاتے۔ جس حصے سے ہم گزر رہے تھے، نیچے حسین باغات تھے جن کا حسن فریب سے پاک تھا۔ یقیناً یہ نیک لوگوں کی قیام گاہ تھی۔ یہاں اتر کر سرسبز گھاس پر ہاتھ پھیرا، بے انتہا نرمی کا احساس ہوا، گویا گھاس نہ ہو، نرم قالین بچھایا گیا ہو۔

جوبی پہاڑ کا علاقہ حسین تھا مگر اس کی خوب صورتی اس مقام کے آگے ماند تھی۔ قیمتی پتھروں سے بنے گھر اور شیشے جیسے فرش تھے۔ گھروں کی بناوٹ پر گولائی غالب تھی اور ایک دوسرے سے مخصوص فاصلے پر ترتیب سے بنے ہوئے تھے۔ فضا مہکتے پھولوں کی خوش بو سے معطر تھی۔ کچھ لوگ گھومتے پھرتے نظر آئے۔ صاف ستھرے لباس، خوش باش اور مطمئن چہرے۔ اس دوران تین مرتبہ گھنٹہ بجنے کی آواز سنی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے معاونین کی طرف دیکھا تو وہ آواز کی سمت بڑھے۔ جلد ہم بڑی عمارت کے سامنے تھے۔ اندر سے کھانوں کی خوش بو آرہی تھی۔ عمارت میں داخل ہو کر مخصوص حصے کا رخ کیا۔ یہ جگہ خاص لوگوں کے لئے مختص، اور اس وقت خالی تھی۔ ہمارے پہنچتے ہی خادم حرکت میں آئے۔ دستر خوان بھی سنگی تھا جسے چار فٹ قطر کی گولائی میں میز کی شکل دیتے ہوئے زمین سے دو فٹ اونچا رکھا گیا تھا۔ ہال نما کمرے میں اس طرح کی دسیوں میزیں تھیں جن کے گرد چھ لوگ آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی دستر خوان کو انواع واقسام کے کھانوں سے چن دیا گیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر پہلا لقمہ لیا۔ ذائقہ ناقابلِ بیان تھا۔ اس جگہ آکر واپسی کا خیال طبیعت پر گراں محسوس ہوا۔ ہر تھوڑے فاصلے پر ایسی عمارتیں تھیں جہاں سے کھانے اور کپڑے کی تقسیم کا خاص اور مفت انتظام تھا۔

یہاں کے مکینوں کی پیشانی ان کا تعارف تھا جس پر ان کے حال اور مقام کی فلم روشنی کی صورت میں گزرتی تھی اور اسی کے مطابق مکینوں کو

سہولیات دستیاب تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد مجھے سونے کے تاروں سے بنا اسکارف تحفے میں دیا گیا جسے میں نے پہن لیا اور ہم روانہ ہوئے۔

معاونین تیزی سے پرواز کر رہے تھے۔ چند لمحوں بعد میں نے ان کے اندر بے چینی محسوس کی اور اس کے ساتھ ہی ہم ایسے علاقے میں داخل ہوگئے جو گزشتہ علاقے کے برعکس تھا۔

معاونین کے اشارے پر اسکارف کے پلو سے منہ ڈھانپ لیا۔ جگہ جگہ تعفن کے ڈھیر اور گندا پانی۔ حشرات کی بہتات اور بدبودار کثیف دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ کھولی نما چھوٹے چھوٹے گھر، تنگ گلیاں، میلے لباس میں لوگ خود کو ایذا پہنچاتے ہوئے نظر آئے۔

ایک صاحب ترازو لئے بیٹھے ہوئے تھے اور کوشش تھی کہ میزان برابر ہو لیکن ہر بار ناپ تول میں فرق ہوتا۔ وہ زچ ہو کر بال نوچتے اور چہرے پر تھپڑوں کی برسات کر دیتے۔ دوبارہ تولتے اور ناکامی پر خود کو ایذا پہنچاتے۔

معاونین نے بتایا کہ انہیں واپسی کے احکامات ملے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، ہم واپس اسی میز کے سامنے کھڑے تھے جہاں سے سب کو اس علاقے میں رہائش سے مطلع کیا جا رہا تھا۔

یہاں مزید قیام کی اجازت چاہتی تھی۔ میز کے دوسری طرف بیٹھے روشن چہرے نے شہادت والی انگلی میرے ابرو کے درمیان رکھ دی۔ ہلکی سی ٹھنڈی چبھن کے ساتھ آنکھوں کے سامنے اپنے گھر کا منظر روشن ہوا۔

گھر میں عزیز و اقارب جمع تھے۔ والدہ پر نظر پڑتے ہی اوسان خطا ہوگئے۔ ان پر غشی کا عالم تھا۔ ان کے سامنے سفید چادر میں پڑے ہوئے جسم کو دیکھا تو وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ یہ وہ کمرا تھا جسے کومے کی حالت کے دوران گھر میں میری دیکھ بھال اور علاج کے لئے مختص کر کے آئی سی یو کا درجہ دیا گیا تھا۔ میں اپنے بے حرکت جسم کا جائزہ لے رہی تھی کہ سوجی ہوئی سرخ آنکھوں کے ساتھ ابو کمرے میں داخل ہوئے۔ چند رشتہ دار خواتین غسل کی تیاری کے لئے کھڑی ہوئیں۔ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔

منظر بدلا اور اپنے بہنوئی اسمٰعیل بھائی کو تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے دیکھا۔ ان کے ہمراہ "غنی بابا" نامی صاحب سفید ململ کا کپڑا سر پر لپیٹے شانِ بے نیازی سے بیٹھے تھے۔ یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے حادثے کے دوران مدد کی تھی اور اسپتال میں خون کا بندوبست کیا تھا۔ یہ اسمٰعیل بھائی کو کہاں سے مل گئے اور کہاں جا رہے ہیں؟

(قسط: ۱۷)

ادارہ

اولی الالباب بچے

اللہ تعالیٰ چھپا ہوا خزانہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ مخلوق مجھے پہچانے تو محبت سے مخلوق کو تخلیق کیا اور کائنات بنائی۔ کائنات اور جو کچھ اس میں ہے وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے واقف ہونے کی نشانیاں ہیں۔ جو چھوٹے اور بڑے بچے غور و فکر کرتے ہیں، وہ اولی الالباب (عقل و دانش والے) کہلاتے ہیں۔ بچو! ذہن استعمال کیجئے، سوچئے اور جو جواب ذہن میں آئے، ہمیں بھیج دیجئے۔ ہمارا پتہ ہے: بچوں کا قلندر شعور، عظیمی محلہ، سرجانی ٹاؤن، کراچی۔

ذہین بچو! السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

دو مختلف پودوں یا درختوں کے پتوں کا انتخاب کیجئے۔ پتے سائز میں بڑے ہوں۔ خشک کرنے کے لئے ایک پتہ سائے میں اور دوسرے پتے کو دھوپ میں رکھئے۔

دو سے چار دن بعد پتے خشک ہو جائیں تو تجربہ کیجئے۔

تجربہ نمبر ا— دونوں پتے فاصلے پر رکھ کر ان کے درمیان اپنا ہاتھ رکھئے۔ پہلے ایک پتے کو اور پھر دوسرے پتے کو غور سے دیکھئے۔ بتائیے آپ کے ہاتھ اور پتوں میں کیا شے ایک جیسی ہے؟

تجربہ نمبر ۲— پتوں کے خشک ذرات احتیاط سے الگ کیجئے جیسے سردی میں سوپ بنانے کے لئے بوٹی میں سے گوشت علیحدہ کیا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ جس ڈھانچے نے پتے کو سہارا دیا ہے، وہ محفوظ رہے۔ دونوں پتوں کے ڈھانچے کو سفید کاغذ پر رکھ کر غور سے دیکھئے اور بتائیے کیا نظر آیا؟

* تجربات کا نتیجہ بھیجنے کی آخری تاریخ 20 دسمبر ہے۔

س : اکتوبر 2020ء میں بچوں سے پوچھا گیا تھا کہ پرندے اڑتے ہیں، آدمی نہیں اڑتا۔ کیا ایسا شخص حیوانات سے افضل ہو سکتا ہے؟

- **ابراہیم عمران، جماعت پنجم (شارجہ):** آج کا آدمی حیوانات سے خستہ حال ہے۔ اسے کچھ معلوم ہے نہ اس کی کسی دوسری مخلوق سے دوستی ہے۔ دوسری مخلوقات کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کسی وائرلیس سسٹم کے ذریعے منسلک ہیں۔
- **علی حمزہ (پشاور):** آدمی لوہے سے جہاز بنا سکتا ہے لیکن gravity کی وجہ سے خود نہیں اڑ سکتا۔ گریویٹی اسے زمین کی طرف کھینچتی ہے۔ اڑنے کے لئے ٹائم اور اسپیس سے آزاد ہونا پڑے گا اور آزادی روح سے واقف ہو کر ملتی ہے۔ روح سے واقف انسان حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے۔
- **شائستہ، جماعت دوم (کراچی):** آدمی اس لئے نہیں اڑتا کیوں کہ اسے پتہ نہیں ہے کہ وہ اڑ سکتا ہے۔
- **فاطمہ عمران (شارجہ):** ہم اپنے ذہن کا مخصوص حصہ استعمال کرنے کی وجہ سے کم چیزوں سے واقف ہیں۔ حیوانات اپنے ذہن سے واقف ہیں۔
- **باسم (آسٹریلیا):** آدمی جسم کو سب کچھ سمجھتا ہے اور روح سے واقف نہیں اس لئے حیوان سے کم تر ہے۔
- **ذہین (کراچی):** آدمی مراقبہ کی آنکھ سے نہیں دیکھتا اس لئے اپنے آپ سے واقف نہیں۔
- **عظمیٰ، جماعت چہارم (آسٹریلیا):** اللہ نے جو علم سکھایا ہے، اسے نہ سیکھنے سے ہمارا شمار جانوروں میں ہو گا۔
- **احمد محی الدین، جماعت ہشتم (چشمہ):** آدمی نہیں اڑ سکتا، انسان اڑ سکتا ہے۔ میں نے خود کو خواب میں اڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا مطلب میرے اندر اڑنے کی صلاحیت ہے۔
- **محمد قاسم، جماعت دوم:** جو صفات کا علم سیکھ لیتا ہے، وہ انسان ہے۔ جو نہیں سیکھتا، وہ آدمی ہے۔
- **دیگر بچوں کے نام:** انعام ممتاز، خوش بخت (دبئی)، منتہیٰ مفیض (کراچی)، اریبہ، عبداللہ، ریان، فیضہ، حرا، عارف، عبدالرحمٰن (فیصل آباد)، احسن، رقیہ، انعم (پشاور)، حامد، آمنہ (چشمہ)، حسین، علیم (عجمان)۔
- نورالعین، قاسم، انیس، اعیان، انعم، رقیہ اور آمنہ نے خوب صورت کارڈ بنا کر بھیجے ہیں۔

چشمہ ــــ آگ اور پانی

احمد اسکول سے گھر آیا تو چہرے پر تھکن اور پریشانی تھی۔ عموماً جب وہ گھر میں داخل ہوتا تو دوڑ کر دادا اور دادی کے گلے لگ جاتا، پھر سب کو سلام کرتا تھا۔ اس روز دھیمی آواز میں سلام کر کے کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ دادا نے ہنستے ہوئے کہا، لگتا ہے آج ہمارا شہزادہ مس سے ڈانٹ کھا کر آیا ہے۔ دادی اور امی مسکرائیں۔

امی احمد کے پاس گئیں اور پوچھا، کیا ہوا؟

اس نے کہا، آج مجھے سائنس کی کلاس میں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مس نے ڈانٹا کہ توجہ سے سنو۔ امی! میں دھیان سے سن رہا تھا لیکن ذہن میں دوسری چیزیں آجاتیں جس سے مس کی کہی ہوئی بات ذہن سے نکل جاتی تھی۔

امی کچھ کہتے کہتے رکیں اور احمد کی بات پر مسکرا دیں۔ کوئی بات نہیں، میں سمجھا دوں گی۔

❦

شام کو گھر والے چائے پی رہے تھے۔ امی نے احمد کی پیالی میں چائے ڈالی اور ڈالتی چلی گئیں۔ پیالی بھر گئی اور چائے باہر گرنے لگی۔

احمد بولا، امی! چائے گر رہی ہے۔

انہوں نے ہاتھ روکا اور پوچھا، جانتے ہو چائے پیالی میں کب جاتی ہے؟

احمد نے کہا، جب پیالی خالی ہوتی ہے۔

بیٹا! پیالی تمہارا ذہن ہے اور چائے مس کا پڑھایا ہوا سبق ہے۔ جب ذہن میں دوسری چیزیں ہوں گی تو مس کی باتیں کیسے سمجھ میں آئیں گی؟ بھرے ہوئے ذہن میں نئی بات داخل ہو سکتی ہے تو پیالی میں مزید چائے آسکتی ہے۔

احمد نے حیرانی سے سب کو دیکھا۔ دادا دادی نے مسکراہٹ چھپانے کے لئے پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ امی نے کہا، ہر وقت ٹی وی دیکھو گے تو صبح اٹھ کر ذہن میں کیا ہوگا؟ وہی جو ٹی وی میں دیکھا۔ مس کی بات سمجھنے کے لئے ذہن کو ادھر ادھر کی باتوں سے خالی کرو۔

وہ سمجھ گیا کہ کھیل کے وقت کھیل، پڑھائی کے وقت پڑھائی۔ ہر کام وقت پر کرنے سے

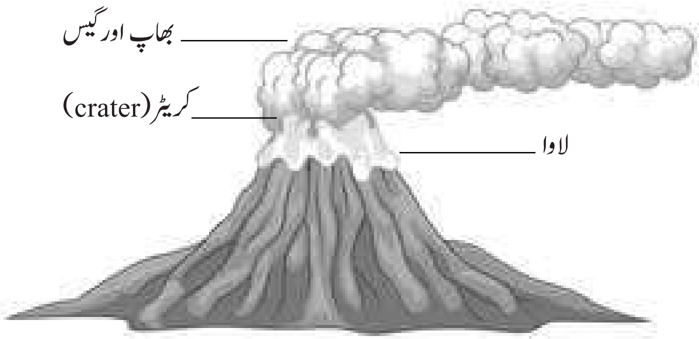

ذہن کی رفتار تیز ہوتی ہے اور سبق ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

اگلے روز اتوار تھا۔ امی نے ناشتا بناتے ہوئے کہا، سائنس کی کلاس میں جو بات سمجھ میں نہیں آئی وہ ناشتے کے بعد پوچھ لینا۔

امی! مس ان پہاڑوں کے بارے میں بتا رہی تھیں جن سے لاوا نکلتا ہے۔ ان کو آتش فشاں کہتے ہیں۔ پہاڑوں سے ٹھنڈے پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں پھر گرم لاوا پہاڑ میں کیسے آگیا ——؟

امی بولیں، بیٹا! اللہ کی شان ہے۔ کسی پہاڑ سے ٹھنڈا پانی اور کسی سے لاوا نکلتا ہے۔

احمد حیران تھا۔ لیکن کیسے۔ کیا پہاڑوں میں آگ ہے جو لاوا ابلتا ہے ——؟

کیتلی میں چائے کے لئے پانی ابل رہا تھا۔ بیٹے سے کہا، فاصلے سے کھڑے ہو کر کیتلی غور سے دیکھو اور جو تبدیلی نظر آئے، ذہن میں محفوظ کر لو۔ پھر سمجھاؤں گی کہ لاوا کیسے ابلتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد پانی ابلنے کی غڑ غڑ آواز آئی۔ پھر کیتلی کے پائپ نما حصے، جس سے چائے ڈالتے ہیں، بھاپ نکلنے لگی۔ امی نے احتیاط سے ڈھکن اٹھایا اور چائے کی پتّی ڈال کر دوبارہ ڈھک دیا۔

پوچھا، پانی ابلنے سے بھاپ کیوں بنتی ہے؟

امی نے کہا، حدت یا گرمی سے پانی بھاپ میں تبدیل ہوتا ہے۔ بھاپ گیس ہے۔ گیس جمع ہوتی ہے تو باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتی ہے۔ اسی لئے کیتلی میں سے بھاپ نکل رہی ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے دودھ ڈالا۔ جوش آیا، چائے ابل کر گرنے والی تھی کہ انہوں نے چولہا بند کر دیا۔

احمد نے دیکھا کہ جب پانی ابلا تو گرنے کے

بجائے ـــــ بھاپ بن کر اڑ گیا۔ پھر دودھ ڈالنے سے چائے کیوں کیتلی سے باہر آنے لگی؟

یہی بات امی سے کہی تو وہ بولیں، شاباش! سوال اچھا ہے۔ جب توجہ ایک خیال پر رکتی ہے پھر اس طرح کے سوال ذہن میں آتے ہیں۔ دیکھو! پانی کو جوش دینے سے پانی جھاگ بنا۔ جھاگ میں چھوٹے بڑے خانے (بلبلے) ہیں۔ ان خانوں میں بھاپ جمع ہوتی ہے۔ بھاپ اڑتی ہے تو جھاگ بیٹھ جاتا ہے۔ آئندہ جب تم چائے پکتے ہوئے دیکھو تو غور کرنا کہ پانی میں دوسری چیزیں شامل کرنے سے جھاگ زیادہ بنتا ہے۔ جیسے پتّی اور دودھ ڈالنے سے پانی کا رنگ تبدیل ہوا اور جھاگ زیادہ بنا پھر اوپر آیا اور کیتلی سے باہر گرنے لگا۔ اچھا ایسا کرو دستر خوان بچھا کر پلیٹیں لے جاؤ۔ میں چائے لاتی ہوں۔

احمد کے ذہن میں کئی سوال تھے مگر امی نے اسے کام میں لگا کر تجسس بڑھا دیا۔

ناشتا کرتے وقت پیالی میں چائے ڈالی۔ پیالی میں سے بھاپ کے بادل نکلے۔ تھوڑی دیر بعد بھاپ نکلنا بند ہو گئی۔ جب تک چائے گرم تھی، بھاپ نکلتی رہی۔ چائے ٹھنڈی ہونے سے بھاپ چائے میں چھپ گئی۔

دیکھیں اماں! چائے ٹھنڈی ہونے سے بھاپ نکلنا رک گئی ہے۔ احمد نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

امی نے کہا، اگر تم چائے کو آنچ پر رکھو تو دوبارہ بھاپ نکلے گی۔

اچھا! کیا آپ کو معلوم ہے کہ پانی میں سے بھاپ نکل کر کہاں غائب ہوتی ہے؟

بیٹا! وہ اڑ کر پہاڑوں پر جم جاتی ہے یا پہاڑ بن جاتی ہے۔ احمد نے پوچھا، وہ کیسے؟

دیکھو! بھاپ اڑ رہی ہے۔ اڑ کر وہ اتنا اونچا چلی جاتی ہے جہاں ٹھنڈ ہے۔ وہاں پہنچ کر بادل بنتی ہے۔ بھاپ میں وہ ذرّات جو ہلکے ہیں انہیں ہوا اڑا کر ٹھنڈے علاقوں میں لے جاتی ہے، وہاں بادل جم جاتے ہیں۔ ان سے برفانی پہاڑ بنتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

"تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو اور قیاس کرتے ہو کہ یہ جمے ہوئے ہیں۔ یہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔" (سورۃ النمل، آیت ۸۸)

امی نے مزید بات نہیں کی اور ناشتا کرنے لگیں۔ دادا دادی انجان بنتے ہوئے ماں بیٹے کی گفتگو سن رہے تھے۔

احمد خاموش نہ رہ سکا اور پوچھا، آپ کی چائے بن گئی لیکن میرا سائنس کا ہوم ورک رہ گیا۔

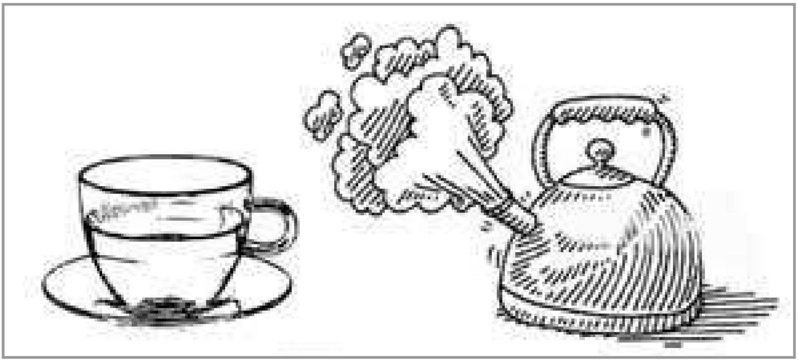

بھاپ کا آتش فشاں سے کیا تعلق ہے؟

امی نے کہا، چلو! برتن اٹھانے میں میری مدد کرو، پھر آرام سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔

ناشتے کے بعد وہ سائنس کی کتاب کھول کر امی کے پاس بیٹھ گیا۔ سامنے آتش فشاں کی تصویر تھی۔ دیکھا کہ ایک بڑا پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر گڑھا بنا ہوا ہے اور اس میں سے دھواں اور دہکتا ہوا سرخ لاوا ابل رہا ہے۔

چھوٹی بہن آمنہ کتاب میں جھانکتے ہوئے بولی، یہ آتش فشاں نہیں، آپ ہیں۔ جب آپ کو غصہ آتا ہے تو اسی طرح کانوں سے دھواں نکلتا ہے اور آنکھیں سرخ ہوتی ہیں۔

اس نے منہ پھلاتے ہوئے بہن کو دیکھا۔

وہ ہنستے ہوئے کمرے سے چلی گئی۔

امی نے کہا، یہ آتش فشاں نہیں، کیتلی ہے۔

احمد بولا، آمنہ کہتی ہے یہ میں ہوں، اور آپ کہہ رہی ہیں یہ کیتلی ہے۔ کیا ہو گیا ہے سب کو؟

امی ہنستے ہوئے بولیں، میرا مطلب تھا کہ کیتلی اور آتش فشاں تقریباً ایک جیسے ہیں۔

تعجب سے پوچھا، وہ کیسے؟

امی نے سمجھایا، دیکھو! پہاڑ کا دہانہ یا منہ جس سے بھاپ اور گرم لاوا نکلتا ہے، کیتلی کے سوراخ کی طرح ہے جہاں سے بھاپ نکلتی ہے۔ زمین کے اندر پانی، معدنیات اور چٹانیں ہیں۔ جب ان کو حدت ملتی ہے تو یہ پگھلتی ہیں، ابال آتا ہے اور بھاپ بنتی ہے۔ ان کو اتنی گرمائش ملتی ہے کہ آگ کا سمندر یعنی لاوا بن جاتا ہے جو باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتا ہے۔ جس سوراخ سے لاوا پہاڑ سے نکل کر ظاہر ہوتا ہے اسے سائنسی زبان میں

کریٹر (crater) کہتے ہیں۔

امی! چٹانیں (معدنیات) کیوں پگھلتی ہیں؟ چولہے میں آگ جلتی ہے۔ کیا زمین کے اندر بھی آگ ہے؟ امی بولیں، کہہ سکتے ہیں۔ زمین کا اندرونی حصہ بہت گرم ہے۔

اس نے سوال کیا، لیکن اتنی گہرائی سے چیزیں اوپر کیسے آتی ہیں؟

جس طرح کیتلی میں اوپر آتی ہے۔ یعنی بھاپ کی مدد سے۔ بھاپ میں کسی بھی شے کو دھکیلنے کی طاقت ہے۔ پہلے وقتوں میں ریل گاڑی کے انجن بھاپ سے چلتے تھے۔ اسی طرح پہاڑ کے اندر لاوا بھاپ کی مدد سے اوپر آتا ہے۔ جب لاوا نکلتا ہے تو ان علاقوں سے لوگ نقل مکانی کر لیتے ہیں لیکن ہر چیز کے فوائد اور نقصانات دونوں ہیں۔ لاوے کی مدد سے زمین کی انتہا میں موجود قیمتی معدنیات جن میں ہیرا، سونا، تانبا، گریفائٹ وغیرہ شامل ہیں، اوپر آجاتے ہیں۔

امی کی بات ختم ہوتے ہی دادا جی کی آواز آئی۔ ہاں بھئی احمد بیٹا! ہمیں بتاؤ کہ تم کیا سمجھے۔ کیتلی آتش فشاں ہے یا آتش فشاں کیتلی ہے؟

اس نے پُرجوش لہجے میں کہا، دادا جی! دونوں باتیں درست ہیں۔

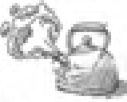

میں پانی ہوتا ہے۔ پانی میں مختلف چیزیں ڈالتے ہیں تو پانی کا رنگ بدل جاتا ہے، مسلسل جوش آنے سے بھاپ بنتی ہے اور پانی اوپر آتا ہے۔ اس کو ہم چائے کہتے ہیں۔

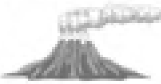

کے اندر جتنی چیزیں ہیں، ان کو مسلسل گرمائش ملتی ہے تو وہ پگھلتی ہیں اور بھاپ جمع ہوتی رہتی ہے۔ ایک وقت کے بعد جب بھاپ کو نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو پہاڑ کھلتا ہے اور مختلف چیزوں سے بنا گرم گرم پانی نکلتا ہے جس کو لاوا کہتے ہیں۔

دادا بولے، شاباش! اس میں ایک سبق اور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیز جتنی بڑی بنائی ہے، اسے چھوٹے سائز میں بھی بنایا ہے۔ جیسے آتش فشاں اور کیتلی۔ اب تم اس جیسی دوسری مثالیں تلاش کرو۔ (بچو! آپ بھی تلاش کیجیے)

احمد نے کاپی کھولی اور جو کچھ اماں نے سمجھایا تھا، لکھا اور نظریں خلا میں جم گئیں......

ذہین بیٹا

تیمور کی عمر دس سال تھی۔ وہ والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ ابو شہر کے بڑے تاجر تھے۔ مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ کئی روز بیٹے سے ملاقات نہ ہوتی۔ گھر آتے تو تیمور سو چکا ہوتا، صبح اسکول جانے کے وقت وہ سو رہے ہوتے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ دوسرے بچوں کے والدین کی طرح ابو ساتھ سیر کو جائیں، پارک میں کھیلیں اور کہانی سنائیں۔

وہ امی سے کہتا تھا، ہمارے پاس سب کچھ ہے، ابو اتنے پیسے کما کر کیا کریں گے؟

امی سمجھاتی تھیں کہ وہ ہمارے لئے محنت کرتے ہیں۔ یہ مت سمجھنا کہ تم سے غافل ہیں۔ رات کو تم سو جاتے ہو تو تمہارے کمرے میں آتے ہیں اور پیار کرتے ہیں۔

ایک روز تیمور اسکول سے گھر آیا تو ابو کو دیکھ کر دوڑتا ہوا ان کے گلے لگ گیا اور پوچھا، آج آپ جلدی کیسے آ گئے؟

انہوں نے پیار کیا اور کہا، جاؤ شاباش! کپڑے تبدیل کرو، پھر ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔

کھانے کی میز پر وہ چہک رہا تھا۔

بابا! شام کو سیر کو چلیں؟

ان کا جواب سن کر تیمور کے چہرے پر سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ بیٹا! کسی اور دن چلیں گے۔ شام کو میری لاہور کی فلائٹ ہے۔

ابو کے گھر جلدی آنے کی وجہ جان کر خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ دل افسردہ ہو گیا کہ میرے لئے گھر نہیں آئے، اپنے کام سے آئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد پوچھا، واپس کب آئیں گے؟

کل شام کو واپسی ہے، انشاء اللہ۔

تیمور نے انہیں خاموشی سے دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے کھانا کھانے لگا۔

ابو! آپ کتنا کما لیتے ہیں؟ ایک اور سوال کیا۔

امی تیمور کے جذبات سے واقف تھیں۔ بیٹے کے سوال پر کھانا کھاتے ہوئے ان کا ہاتھ رک گیا۔ ابو دس سال کی عمر کے بچے کا سوال سن کر

حیران ہوئے کہ اس کے ذہن میں یہ بات کیوں آئی۔ وہ بیٹے کے سامنے کاروباری معاملات پر بات نہیں کرتے تھے۔

انہوں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا کہ ابھی آپ نے گنتی سیکھی ہے، جب بڑے ہو جائیں پھر بتاؤں گا۔ آپ کو کچھ چاہیئے تو بتائیں؟

نہیں ابو! مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ بس یہ بتا دیں کہ اتنے پیسے کما کر آپ خوش ہیں؟

ہنستے ہوئے کہا، جی! میں خوش ہوں اور خوش کیوں نہ ہوں، اللہ نے مجھے ذہین بیٹا دیا ہے۔

ابو! آپ نے جواب نہیں دیا۔ ایک گھنٹے میں آپ کتنا کماتے ہیں؟ سنجیدگی سے پوچھا۔

دوبارہ یہی سوال سن کر ان کی پیشانی پر بل آ گئے۔ انہوں نے کہا، آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں، یہ بڑوں کی باتیں ہیں۔

ابو! میں بتاتا ہوں لیکن پہلے آپ بتائیے کہ ایک گھنٹے میں کتنا کما لیتے ہیں؟

انہوں نے کہا، تقریباً ایک لاکھ۔

تیمور نے چمچ پلیٹ میں رکھا اور دوڑتے ہوئے اپنے کمرے میں گیا۔

امی ابو نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

اتنے میں تیمور کے کمرے سے کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ امی فوراً اٹھیں اور تیزی سے بیٹے کے کمرے کی طرف گئیں۔

دیکھا کہ تیمور کا غلّک ٹوٹا ہوا ہے، ٹکڑے فرش پر بکھرے ہوئے ہیں اور وہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان بیٹھا پیسے گن رہا ہے۔

تیمور! یہ کیا ہو رہا ہے۔ غلّک کیوں توڑ دیا۔ پیسے گننے کا یہ کون سا وقت ہے۔ کھانا چھوڑ کر کیوں آئے۔ ایک ساتھ کئی سوال تھے۔

امی! بس میں ابھی آیا۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ تیمور کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ خاموشی سے واپس چلی گئیں اور شوہر کو بتایا کہ آپ کا بیٹا ہے، کھانا چھوڑ کر پیسے گن رہا ہے۔ پہلے کبھی ایسا نہیں کیا۔

وہ بولے، اس کے ذہن میں کوئی بات ہے۔

تیمور باہر آیا اور پیسے والد کو دیتے ہوئے خوشی سے کہا، ابو! میرے ساتھ بزنس کریں گے؟

وہ حیرت بھول کر ہنس دیئے۔ کہا، ضرور! کیوں نہیں۔ ان روپوں کے بدلے کیا چاہیئے؟

بیٹے نے باپ سے کہا، آپ کے چند گھنٹے! اس وقت میرے پاس پانچ ہزار نو سو روپے ہیں۔ باقی رقم سال کے آخر تک دے دوں گا۔

بیٹے کی بات سن کر انہیں جھٹکا لگا۔ کچھ دیر تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں۔ پھر کرسی سے اٹھے اور اسے گلے لگاتے ہوئے کہا، میرا سب کچھ آپ کا ہے۔

لیکن ابو! آپ میرے نہیں ہیں۔ آپ کے پاس میرے لئے وقت ہے نہ امی کے لئے۔ ہمیں آپ سے محبت ہے، آپ کے پیسوں سے نہیں!

امی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جو بات وہ شوہر کو سمجھا نہ سکیں، بچے نے سمجھا دی تھی۔

ابو نے سیکریٹری کو فون ملا کر کہا کہ ان کی میٹنگ اور فلائٹ منسوخ کر دیں۔

دنیا میں ہر شے کی قیمت ہے لیکن وقت کی کوئی قیمت نہیں۔ وقت انمول ہے۔ محبت اسی سے ہوتی ہے جس کے لئے ہم وقت نکالتے ہیں۔ والدین اور اولاد کا ایک دوسرے کے لئے سب سے بڑا تحفہ وقت ہے۔

جس نے سوچا......اس نے جانا

۱) یہ دنیا فانی ہے
پتھر میں پانی ہے

۲) جب بھی وہ میدان میں آئے
قدم قدم پر ٹھوکر کھائے
اچھلے کودے دوڑے بھاگے
سب ہیں پیچھے وہ ہے آگے

۳) چھوٹی چھوٹی سرخ اور کالی
محنتی، ذہین اور ہمت والی
ہر گز کوئی نہ اسے ستائے
کاٹے سے اس کے ہاتھی مر جائے

۴) وہ بزدل ہے جس نے اسے کھایا
بہادر ہے وہ جس نے پی کر دکھایا

۵) کان پکڑ کر ناک پہ بیٹھے
ناک چڑھی کہلائے
لوگ اسے آنکھوں پہ بٹھائیں
اور یہ پھولے نہ سمائے

جواب تصویروں میں تلاش کیجئے:

ننھی گلنار

گلنار نام کی طرح سرخ اور گول مٹول تھی۔ وہ دادی کے ساتھ رہتی تھی۔ دادی اماں خوب صورت اور نیک سیرت تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ گلنار کام یاب اور اچھی انسان بنے۔ بچو! آپ جانتے ہیں کہ کام یاب انسان اور ناکام آدمی کون ہوتا ہے؟ آیئے مثال سے سمجھتے ہیں۔

اماں نے زید کو بازار سے دھنیہ لینے بھیجا۔ راستے میں مداری ملا۔ زید سے پوچھا، بندر کا تماشا دیکھو گے؟ اس نے فوراً ہامی بھرلی۔ مداری نے کہا، لاؤ 15 (پندرہ) روپے۔ سوچے سمجھے بغیر پیسے مداری کو دے دیئے۔ تماشا شروع ہوا اور زید بھول گیا کہ اماں نے بازار کیوں بھیجا تھا۔

خوشی خوشی گھر لوٹا۔ اماں کو معلوم ہوا کہ دھنیے کے لئے دیئے گئے پیسے بندر کے تماشے پر خرچ کر دیئے ہیں تو بتایئے انہوں نے خوشی ظاہر کی یا ناراضی کا اظہار کیا؟ زید کو جس مقصد کے لئے بازار بھیجا تھا، وہ اسے بھول گیا۔

عقل مند بچو! اس دنیا کی حیثیت بازار کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا میں اس لئے بھیجا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں، نعمتوں پر غور کریں اور اللہ سے ملنے کا راستہ تلاش کریں۔

جو لوگ اپنا مقصد بھول کر تماشا دیکھنے میں گم ہو جاتے ہیں، وہ ناخوش رہتے ہیں۔ اور جو بچے اللہ سے واقف ہونے کی کوشش کرتے ہیں ان کو دنیا بھی ملتی ہے اور اللہ کی قربت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ اصل کام یابی ہے۔

دادی کہتی تھیں، ننھی گلنار! تم وہ پھول ہو جس سے باغ میں رونق ہے۔ اگر تم اپنے اندر خوش بو سے واقف ہو جاؤ تو تتلیاں تمہارے گرد جھومیں گی، بلبل تمہاری محبت میں گیت گائیں گے اور تمہاری روشنی سے اندھیرے دور ہوں گے۔

گلنار کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ دادی کا مکان بڑا اور صحن میں حوض تھا۔ دو سفید بطخیں

تالاب میں تیرتی تھیں جن کو دیکھ کر گلنار حوض کے کنارے بیٹھ کر پانی میں پیر ڈال دیتی۔

ایک روز معلوم ہوا کہ بطخ کے پَر پانی میں گیلے نہیں ہوتے، میرے پیر گیلے ہو جاتے ہیں؟

دادی اماں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ بطخوں کے جسم سے خاص قسم کا تیل خارج ہوتا ہے جسے وہ پروں پر مل لیتی ہیں۔ تیل اور پانی آپس میں جذب نہیں ہوتے اس لئے بطخ کے پَر پانی میں خشک رہتے ہیں۔ جانتی ہو اس میں ہمارے لئے سبق ہے۔

کیسا سبق دادی؟ گلنار نے پوچھا۔

یہی کہ دنیا میں رہتے ہوئے ان چیزوں کا اثر قبول نہ کرو جو عارضی ہیں۔

صحن کے چاروں طرف کمرے تھے۔ ایک کمرے میں قالین بُنے جاتے تھے۔ ہر صبح دادی اماں قالین بُنتی تھیں اور پوتی سمیت پڑوس کی بچیوں کو بھی قالین بُننا سکھاتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ پڑھائی کے ساتھ کوئی ہنر سیکھنا چاہئے۔

دادی کے بنائے ہوئے نقش و نگار پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ قالین میں بنے پھولوں پر اکثر تتلیاں بیٹھ جاتیں اور مور کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ابھی رقص شروع کر دے گا۔

دکان دار ان قالینوں کو معمولی قیمت میں خرید کر مہنگے داموں فروخت کرتے تھے۔ دادی کو معلوم تھا لیکن صبر کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ اللہ سب کو محنت کا صلہ دیتے ہیں اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔

گلنار سات سال کی ہوئی تو دادی نے سب سے بہترین قالین تحفے میں دیا اور کہا، اللہ نے تمہیں محبت کرنے والا دل دیا ہے۔

ننھے دوستو! قالین بہت خوب صورت تھا۔ کناروں پر سنہرے رنگ کی پتیاں اور رنگین پھول کڑھے ہوئے تھے۔ گلنار کے گال خوشی سے مزید سرخ ہوگئے۔ وہ بولی، حسین قالین کو حسین کام کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔

دادی نے پوچھا، کیا مطلب؟

گلنار چہکتے ہوئے بولی، دادی اماں! آپ ہی تو کہتی ہیں کہ اللہ کے حضور ہمیشہ اچھی چیز پیش

کرنی چاہیئے اور صاف ستھرا لباس پہننا چاہیئے۔

دادی نے کہا، جی بالکل!

آج سے یہ قالین میری جانماز ہے۔

دادی نے یہ سن کر اسے دعائیں دیں۔

گلنار نے اپنی سہیلیوں کو سالگرہ کا تحفہ دکھایا۔

وہ پابندی سے نماز ادا کرتی تھی۔

ایک رات خواب میں دیکھا کہ جب وہ نماز میں سجدہ کرتی ہے تو جانماز میں سجدے کے مقام پر بنی ہوئی کلیاں کِھل جاتی ہیں اور کمرا پھولوں کی خوش بو سے معطر ہو جاتا ہے۔ پھر خود کو پھولوں کے باغ میں دیکھا۔

صبح دادی اماں کو خواب سنایا۔

انہوں نے کہا، خواب میں پیغام ہے کہ بچے اللہ میاں کے باغ کے پھول ہیں۔ جب وہ نماز پڑھتے ہیں، اللہ کے پسندیدہ کام کرتے ہیں تو ان سے پھولوں کی مہک آتی ہے۔

گلنار نے ہاتھوں کو سونگھا تو دادی ہنسنے لگیں اور اسے گلے سے لگالیا۔

دادی ناشتے کی تیاری کر رہی تھیں۔ ریڈیو پر نعت لگی ہوئی تھی۔ گلنار بطخوں کو کھانا دے کر دادی کے پاس آگئی۔ اس دوران دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو کوئی صاحب اپنی بیگم اور بیٹی کے ساتھ کھڑے تھے۔

گلنار نے لڑکی کو دیکھا تو چہکتے ہوئے دادی کو آواز دی۔ اسما آئی ہے، میری سہیلی!

مہمان صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھے۔

اسما کی امی نے کہا، ہماری بیٹی گلنار کی باتیں کرتے تھکتی نہیں ہے۔ سنا ہے آپ نے بچی کے لئے بہت خوب صورت جانماز بنائی ہے۔

گلنار یہ سن کر بھاگتی ہوئی کمرے میں گئی اور جانماز لا کر دکھائی جو مہمانوں کو پسند آئی۔ پھر دادی انہیں قالین والے کمرے میں لے گئیں اور بڑا قالین دکھایا جو چند روز پہلے مکمل کیا تھا۔

اسما کے والد نے کہا، میں قالین کی تجارت کرتا ہوں۔ آپ کے کام میں بہت نفاست ہے۔ آپ سے قالین خریدنا چاہتا ہوں۔

دادی نے انہیں وہ قیمت بتائی جس پر دوسرے دکان دار ان سے قالین خریدتے تھے۔

اسما کے والد مسکرائے اور کہا، میں ہر ماہ آپ

سے قالین خریدوں گا۔

انہیں لفافہ دے کر وہ رخصت ہوئے۔

دادی نے لفافہ کھولا تو جو رقم انہوں نے بتائی تھی اس سے تین گنا زیادہ لفافے میں تھی۔

چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے گھر بیٹھے بیٹھے ایسا خریدار بھیجا جس نے محنت کی قدر کی ۔ پوتی سے کہا، دیکھو گلنار! جب ہم اللہ کی رضا میں راضی ہوتے ہیں تو اللہ غیب سے ہماری مدد کرتا ہے اور وہ راستے کھولتا ہے جو ہمارے تصور میں نہیں ہوتا۔

گلنار نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے نفل پڑھی۔ سلام کے لئے دائیں بائیں منہ پھیرا تو بھینی بھینی خوش بو نتھنوں سے ٹکرائی۔

دوڑتی ہوئی دادی کے پاس گئی اور کہا، خوش بو آرہی ہے۔ کیا آپ نے لگائی ہے؟

دادی بولیں، ارے! میں تو یہاں بیٹھ کر دوپہر کے کھانے میں رائتہ کے لئے دھنیہ پودینہ کاٹ رہی ہوں۔ آؤ بیٹھو! تمہیں خوش بو کا راز بتاؤں۔

بارہویں صدی میں ایک عبادت گزار خاتون تھیں۔ نام بی بی قرسمؒ تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد اپنے بیٹے فرید الدین مسعود کی پرورش کی۔ بیٹے کو شکر بہت پسند تھی۔ قرسم خاتونؒ جانماز کے نیچے شکر کی پڑیا رکھ دیتیں اور کہتی تھیں، جو بچے دل سے نماز ادا کرتے ہیں، ان کو جانماز کے نیچے سے شکر ملتی ہے۔ فرید الدین شوق و توجہ سے نماز پڑھتے اور شکر کی پڑیا مل جاتی۔

ایک روز قرسم خاتونؒ شکر رکھنا بھول گئیں۔

یاد آیا تو بیٹا نماز پڑھ چکا تھا۔

ماں نے پوچھا، نماز پڑھ لی؟ بیٹے نے کہا، جی اماں جان! اور شکر بھی کھالی ہے۔ بی بی قرسمؒ کا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا کہ اللہ نے بچے کی نماز قبول فرمائی اور اس کا یقین قائم رکھنے کے لئے غیب سے شکر کا بندوبست کیا۔ اس دن سے انہوں نے بیٹے کو مسعود شکر گنج کے نام سے پکارا۔ ہم ان کو بابا فرید شکر گنجؒ کے نام سے جانتے ہیں۔

واقعہ سنا کر دادی نے کہا، تمہیں پھول پسند ہیں تم نے دل سے نماز ادا کی۔ اللہ نے نماز قبول فرمائی اور کمرا خوش بو سے معطر ہوگیا۔

خواب تعبیر اور مشورہ

شعاعی تبدیلیاں

ریحان (لاہور): کچھ عرصے سے رات کو سونے سے پہلے سانس کی مشق اور مراقبہ کرتا ہوں۔ نیند گہری آتی ہے۔ خواب میں باغات، نہریں، پہاڑ، رنگ برنگی وادیاں اور دوسرے حسین مناظر دیکھتا ہوں۔ جاگنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ پورے خواب میں، میں انہی کیفیات سے گزرا ہوں۔ مشق میں دل لگتا ہے اور سکون محسوس ہوتا ہے مگر بعض اوقات اکتاہٹ اور بیزاری بھی ہوتی ہے۔

تعبیر: ماورائی مشقوں سے انسان کے اندر روشنیوں میں تبدیلی واقع ہوتی ہے جس کا مظاہرہ محسوسات اور تجربات کی صورت میں ہوتا ہے۔ مثلاً آوازوں کا سننا، کششِ ثقل کے احساس کا ختم ہونا وغیرہ۔ اس کی وجہ تفصیل طلب ہے۔ جب شعاعی تبدیلیاں ہوتی ہیں تو طبیعت فوراً عادی نہیں ہوتی بلکہ فرد آہستہ آہستہ ان چیزوں کا معمول بنتا ہے۔ ماورائی حواس کا غلبہ کچھ دن ہوتا ہے پھر کم ہو جاتا ہے۔ ردِ عمل ہونے پر طبیعت دہرانے لگتی ہے اور رجحان گریز اور تساہل پسندی کی طرف ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے مشق کے معمولات میں فرق پڑتا ہے۔ آپ وقت مقرر کر کے سانس کی مشق اور مراقبہ کیجئے اور وقت پورا کر کے اٹھئے۔ طبیعت میں گریز کے رجحان کی پروا نہ کیجئے۔

جادو ٹونا

رخسانہ (متحدہ عرب امارات): کسی نے مشورہ دیا کہ فلاں عمل کر کے گوشت کے ٹکڑے پر پھونک مارو اور اس میں دس سے زائد سوئیاں لگاؤ۔ پھر ایک خاتون بتاتی ہیں کہ غسل خانے میں جادو کا سامان ملا ہے اس لئے وہاں پانی نہ پھینکا جائے۔ جا کر دیکھا تو لفافے پڑے تھے۔

تعبیر: خواب میں وسوسے، لالچ اور عقیدے کی کم زوری کے نقوش ہیں۔ ذہن ادھر ادھر کے خیالات میں الجھا رہتا ہے۔

مشورہ: سر سے لے کر پیر کے انگوٹھے تک نیلے دھاگے سے گیارہ مرتبہ ناپ کر، اس تار کو چار مرتبہ تہ کر کے دھاگے کے سرے پر ڈھیلی گرہ لگائیے۔ ایک بار سورہ فلق پڑھ کر گرہ میں پھونک ماریئے اور گرہ فوراً کس دیجئے۔ اس طرح گیارہ

گرہیں لگانے کے بعد دھاگا دہکتے ہوئے کوئلوں پر ڈال دیجئے۔ دھاگا جلنے سے بدبو آئے گی۔ یہ عمل 21روز کرنا ہے۔ دھاگا سوتی ہونا چاہئے۔ اس کے بعد بھی سفلی عمل پر یقین باقی رہے تو یہ شیطانی وسوسے کے علاوہ کچھ نہیں۔ جب ایسا کوئی خیال آئے، استغفار کیجئے۔ گھر میں صفائی کا معیار ناقص ہے۔ گھر کی صفائی کے ساتھ خود کو بھی پاک صاف رکھنے کے لئے باوضو رہنا اور روز نہانا ضروری ہے ورنہ خدانخواستہ بیماریوں میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

جذبات کا آئینہ

سامعہ محسن (کامرہ): رشتہ دار کے گھر کے قریب نئے مکان کی تعمیر شروع ہوئی ہے اور دیواریں کھڑی کی جارہی ہیں۔ مکان کے سامنے پہنچی تو جوتوں کے دو جوڑے نظر آئے جو یہ سوچ کر اٹھالئے کہ ایک میں پہنوں گی اور دوسرا کزن کو دے دوں گی۔ کزن سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ گزشتہ روز امی اور بھائی نے تمہیں دیکھا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ انہوں نے دیکھا ہوگا، میں نے ان کو نہیں دیکھا۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔

تعبیر: کزن سے آپ کو کوئی خوشی حاصل ہوگی اور ان سے تعلقات بہتر ہو جائیں گے۔

تجزیہ: رشتہ دار کے گھر جانا اور راستے میں نیا مکان بنتا ہوا دیکھنا آپ کے دلی جذبات کا آئینہ ہے۔ جوتے کی ایک جوڑی کزن کو دینا ظاہر کرتا ہے کہ خواہش کو معاشرتی قدروں میں رہتے ہوئے بیان کرنے سے حالات آپ کے موافق ہو جائیں گے، انشاءاللہ۔

ریل کی پٹری

عامر حمید (فیصل آباد): جنگل میں تالاب ہے۔ دوست کے ساتھ نہا رہا ہوں۔ ہم پریشان ہوئے کہ واپسی کیسے ہوگی۔ قریب ریل کی پٹری ہے۔ ریل گاڑی گزری تو آخری ڈبّا الگ ہو گیا۔ دل کو ڈھارس ملی کہ اس ڈبّے کے لئے انجن آئے گا۔ انجن آیا تو میں اس کے ساتھ لٹک کر قریبی اسٹیشن پر اتر گیا۔

تعبیر: دوست کے ہمراہ تالاب میں نہانے کے بعد اسے چھوڑ کر انجن کے ساتھ لٹک جانا اس طرف اشارہ ہے کہ دوست سے وابستہ توقعات پوری ہونے کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔

سرمئی سانپ

محمد رافع (ماڑی پور) : سرمئی رنگ کا بڑا سانپ گھر کے برابر والی گلی میں رینگ رہا ہے۔ قریب ایک جاننے والے صاحب بیٹھے ہیں۔ میرے کسی بچے نے پتھر مار مار کر سانپ کے ٹکڑے کر دیئے مگر سانپ کا سر چلتے ہوئے ہمارے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ مزید پتھر مارے تو وہ سامنے والوں کے گھر میں گھس گیا۔

تعبیر: لاشعور نے آپ کو خبر دار کیا ہے کہ کوئی پیٹھ پیچھے مخالفت میں مصروف ہے۔ یہ بھی ہے کہ وہ شخص کوئی دور پرے کا نہیں بلکہ اپنوں میں سے ہے۔ واللہ اعلم۔

رشید احمد، لاہور۔ تعبیر: خواب میں بے روزگاری کے حالات کی نشان دہی ہے۔ میں آپ کے لئے دعا گو ہوں۔

عیب جوئی

ثمرین (شارجہ): ایک رشتہ دار نے کہا کہ جلدی تیار ہو جاؤ، محفلِ میلاد میں جانا ہے۔ میں غسل کر کے تیار ہوئی۔ میلاد میں شرکت کے بعد گھر واپس جا رہی تھی کہ راستے میں چوہے پر نظر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی مار دیا۔

تعبیر: خواب دیکھنے والی بہن کو عیب جوئی کی عادت ہے لیکن ساتھ ہی اس بری عادت سے بچنا بھی چاہتی ہیں۔ وہ جس سلسلے میں بیعت ہیں، اس کی تعلیمات پر صدقِ دل سے عمل پیرا ہونے کی خواہش مند ہیں۔

تجزیہ: غسل کرنا پاکیزگی کی علامت ہے۔ محفلِ میلاد میں شرکت، رسول اللہؐ کی تعلیمات پر عمل کرنے کی کوشش ہے۔ چوہا دیکھنا دوسروں کے معاملات میں دخل دینا ہے۔

مشورہ: ہمیشہ اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں پر نظر رکھنی چاہئے۔ عیب جوئی (غیبت) وقت کے ضیاع کے علاوہ کچھ نہیں۔ غیبت کی تصویر یہ ہے کہ ایک آدمی کے منہ میں دوسرے کا خون ہے لیکن وہ کراہت کی وجہ سے اسے پینا نہیں چاہتا۔

چہل قدمی

عدنان امین (لاہور): انجانی عمارت کی اوپر والی منزل پر موجود ہوں اور نیچے آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دیکھا کہ سیڑھیوں سے اترنے کے بجائے ان سے تھوڑا اوپر چلتے ہوئے فضا میں معلق ہو کر نیچے کی منزل تک آ گیا۔ پھر دیکھا کہ باغ میں چہل قدمی کر رہا ہوں۔ اچانک زمین سے چند فٹ اوپر اٹھ کر اڑنا شروع کیا اور انجانی جگہ پہنچ گیا۔

تعبیر: روحانی صلاحیتیں اور علم حاصل ہونے کی نشان دہی ہے۔ ان خداداد صلاحیتوں سے کتنا فائدہ اٹھانا ہے، یہ آپ پر منحصر ہے۔

شیر کا حملہ

زنیرہ عالم (سوات): کسی بزرگ سے بیٹے کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی تھی۔ یاد نہیں کہ کیا پوچھا۔ وہ سوال کا جواب دیتے ہیں کہ اتنے میں شیر آیا اور میرے بیٹے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے بچانے کی کوشش کی۔ شیر قابو میں نہیں آیا۔ اس پر جال پھینک کر چیخنے لگی۔ بہن کے

اٹھانے پر پتہ چلا کہ میں خواب دیکھ رہی تھی ۔ میرے چیخنے سے وہ جاگ گئی۔

تعبیر: خواب میں بتایا گیا ہے کہ بیٹے کا دماغ نزلے سے متاثر ہونے کی وجہ سے اس کی نظر کم زور ہوگئی ہے یا ہوسکتی ہے۔ بہتر ہے کہ آنکھوں کا معائنہ کروایا جائے۔

سیدھا راستہ

عروسہ قسیم (آسٹریلیا): بھائی کے ساتھ جا رہی تھی کہ میدان میں باریک رسی سے بنا پل نظر آیا جو دو تنکوں پر قائم تھا۔ قریب پہنچے تو کسی نے پل پر سے گزرنے کو کہا۔ میں دل میں اسمائے الٰہی اور درود شریف پڑھنے لگی۔ پل کے دونوں جانب راستہ ہے۔ ہمیں اختیار ہے کہ ہم کون سے راستے سے جانا چاہتے ہیں۔ ہم نے سیدھے ہاتھ کی طرف چلنا شروع کیا۔ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے جن کے چہروں پر خوشی تھی۔ دوسرے راستے پر چلنے والوں میں ڈر اور اضطراب کی کیفیات ظاہر تھیں۔ میں نے کہا، اگر انھوں نے درود شریف پڑھا ہوتا تو اس حال کو نہ پہنچتے۔

تعبیر: جو کچھ دیکھا ہے الحمد للہ درود شریف اور یا حی یا قیوم کی برکت کا مظاہرہ ہے۔ خواب بجائے خود تعبیر ہے۔ بعض خواب ایسے ہوتے ہیں کہ تعبیر خواب میں موجود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو صراط مستقیم پر چلنے اور حضرت محمدؐ کی سنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

حلوے کی پلیٹیں

ظہیر اسلم (جگہ نہیں لکھی): بھائی کے ساتھ جا رہا ہوں۔ کچھ دور چلنے کے بعد مکان نظر آیا۔ وہ باجی کے مکان جیسا تھا۔ اس میں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ایک رشتہ دار کے بچے پر غصہ کرتے ہوئے جب مکان تک پہنچا تو آگ بجھ چکی تھی اور جلنے کے آثار بھی نہیں تھے۔ اندر وہ شخص موجود تھا جس نے آگ بجھائی تھی۔ گھر میں سامان دیکھ کر خود سے کہتا ہوں کہ ابھی یہ بھیگا ہوا ہے، خشک ہونے کے بعد اٹھاؤں گا ۔ اس رات ایک اور خواب میں کسی کے ساتھ بیٹھا ہوں کہ ایک جاننے والی خاتون نے بڑا تھال میرے سامنے رکھ دیا جس میں گلابی رنگ کی گول گول حلوے کی پلیٹیں ہیں۔ ایک پلیٹ میں بادامی رنگ کے پیڑے کی شکل میں کافی بڑا حلوہ ہے۔ میں نے پیڑا اور حلوہ کھالیا۔

تعبیر: غلط فہمیاں تھیں جن کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ خواب میں غلط فہمیوں کی وجہ سے تعلقات میں کشیدگی کی تمثیلات ہیں۔ پیار محبت کے ساتھ رہنے سے زندگی اچھی گزرتی ہے۔

ساس بہو

راحیل (سرگودھا): والدہ نے دو ماہ پہلے خواب

دیکھا کہ باورچی خانے کے فرش سے آگ کے شعلے بلند ہورہے ہیں۔ دادی باورچی خانے میں ہیں۔ شعلے ان کی پنڈلیوں تک آرہے ہیں۔ امی دادی کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئیں تو آگ بجھ گئی۔

تعبیر: خواب میں ساس بہو کا روایتی اختلاف نمایاں ہے اور کوئی سنجیدہ بات نہیں۔ آپ کی والدہ کو ساس کی خدمت کرکے دین و دنیا میں سکون حاصل ہوگا اور بڑھاپے میں راحت و آرام ملے گا۔

غار

شائلہ (اسلام آباد): بہت پرانی دو قبریں ہیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر ایک اور پرانی قبر ہے۔ سب پر بڑے بڑے پتھر رکھے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی قبروں پر نظر پڑی تو کانپ اٹھی۔ سوچا کہ قبریں کس کی ہیں۔ اس دوران کوئی کہتا ہے کہ آگے چلو۔ آگے گئی تو وہاں غار تھا جس میں بڑے بڑے پتھر اور جھاڑیاں تھیں۔ قریب ایک خوب صورت خاتون لپ اسٹک لگائے بیٹھی تھیں۔ بال ماتھے کی طرف سے کٹے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھنے میں مگن تھی کہ آواز آئی، ڈرو نہیں، قریب جاؤ۔ سہمے ہوئے انداز میں چلتے ہوئے خاتون کے قریب پہنچی تو آواز آئی، انہیں پیار کرو۔ ان کے رخسار پر پیار سے ہاتھ رکھا، انہوں نے جواباً پیار کیا۔ واپس روانہ ہوئی اور تیزی

ماہنامہ قلندر شعور دسمبر 2020ء

آپ کے خواب اور ان کی تعبیر

پورا نام:............................ والدہ صاحبہ کا نام: ....

پورا پتہ:..

ازدواجی حیثیت:........................ وزن (تقریباً): .... آنکھوں کا رنگ............................

نیند کیسی آتی ہے:............ بلڈ پریشر (نارمل/ہائی/لو):............ تاریخ پیدائش:............................

میٹھا پسند ہے یا نمکین چیزیں زیادہ مرغوب ہیں؟............................فون نمبر............................

خدانخواستہ دماغی، نفسیاتی مرض اور وہم کے مرض میں مبتلا ہوں تو ضرور لکھیں: ہاں / نہیں

مختصر حالات : ....

....

سے باہر آنے لگی۔ ایسا لگا کہ غار میں موجود اشیا مجھے کھینچ رہی ہیں۔ غار سے باہر پیر رکھتے ہی آنکھ کھل گئی۔ جاگنے کے بعد احساس ہوا کہ ہاتھ پیر بھاری ہوگئے ہیں اور جسم حرکت نہیں کررہا۔ یہ حالت کافی دیر قائم رہی۔ اگلی رات خواب نظر آیا کہ باغ میں گھاس پر بیٹھی ہوں۔ وہاں ایک آدمی ہے جس کے ساتھ بچہ ہے۔ بچہ مجھ سے قریب بیٹھا ہے۔ جیسے ہی بچے کو پیار کرتی ہوں، آدمی میری گردن پکڑ لیتا ہے۔ خوف زدہ حالت میں خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ پھر جھٹکے سے خود کو چھڑایا اور آنکھ کھل گئی۔ جسم پر لرزہ طاری تھا۔ تیسرے دن خواب دیکھا کہ ایک ماں بچے کو مارنے دوڑی۔ بچہ بھاگتے ہوئے گرا اور خون میں لت پت ہو گیا۔ میں وہاں سے بھاگ آئی کہ مبادا میرا نام نہ آجائے۔

تعبیر: آپ کے دل کی رگیں متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ پرہیز اور مستقل مزاجی کے ساتھ علاج سے فائدہ ہوگا، انشاءاللہ۔

سلمیٰ شیراز (جگہ نہیں لکھی): بخار تیز ہونے پر بخارات دماغ کی طرف جانے سے اس قسم کے خواب نظر آتے ہیں۔

بھول بھلیّاں

لوحِ محفوظ کا قانون یہ ہے کہ آدمی یا کوئی بھی ذی روح جب بیدار ہوتا ہے تو اس کے اندر لاشعوری تحریکات مغلوب ہو جاتی ہیں (ختم نہیں ہوتیں) اور جب کوئی ذی روح یا آدمی سو جاتا ہے تو اس کے اندر کام کرنے والا شعور مغلوب ہو جاتا ہے (یہ بھی ختم نہیں ہو جاتا)۔ کہنا یہ ہے کہ خواب یا سونے کی حالت میں لاشعور غالب اور شعور مغلوب ہو جاتا ہے اور بیداری کی حالت میں شعور غالب ہوتا ہے اور لاشعور مغلوب ہو جاتا ہے۔ بیداری میں کئے ہوئے اعمال اور دیکھے ہوئے واقعات میں اگر شعور کے ساتھ لاشعوری تحریکات برابر کی شریک ہوں تو یہ واقعات اور اعمال یاد رہتے ہیں ورنہ بھول کے خانے میں چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح خواب میں دیکھے ہوئے واقعات اور کئے ہوئے اعمال میں لاشعور کے ساتھ شعور بھی برابر کی دلچسپی رکھتا ہو تو خواب یاد رہتا ہے ورنہ نظر انداز ہو جاتا ہے یا بھول بھلیّاں بن کر حافظے میں نقش ہو جاتا ہے، جس کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا اور آدمی اس میں ترتیب نہ ہونے کی وجہ سے مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔

your mind each time you come across them. There are chances that you may blindly trust your friend's opinion. However, an open-minded person will never judge anyone based on the observations of others. Those who we like can be disregarded by others, and the people we value the most, may hold no significance in the lives of others.

We accept things that resonate with our ideas, and reject those ideas which do not conform with ours. Every person thinks and speaks according to their level of understanding. When we do not listen to the ideas of others, or judge them for how they think, we miss an opportunity of seeing their life and understanding their learnings. Conversing with people or listening to different opinions with patience can sow seeds of respect and tolerance in the society.

To influence anyone, you should understand the lines on which they think. In doing so, you either become an influencer or someone who is influenced.

Attaining expertise is advantageous, provided it does not subvert the beginner's mind. Such minds are free of self-references. They take criticism constructively and respond in a measured way.

It is a common observation that irrespective of how good we look, we expect others to come and confirm it for us. We sit with and like those who say things that are aligned with our beliefs. We are happy when they reiterate our thoughts to us, and speak what we want to hear. It indicates that we do not want information, rather we want validation.

The world has different preferences that we cannot conform to. Listen to the world, but it should be your call on what to accept. Embrace everyone, for it is an open-minded person who accepts one and all. If prophets had shunned people away, how would they have ever been able to influence people?

The hearts of such people are magnanimous. It overlooks weaknesses and embraces all and sundry. To have such a mind, spiritual teachers advise to undertake the practice of meditation.

Meditation has a calming effect; it helps us attain a mind which remains uninfluenced by disturbing thoughts. Not only this, it gives clarity to thoughts, and helps us see things in their true light. Such people listen to everyone, and do not enforce their opinions, rather, they speak through their actions. They love all, and hate none.

Meditation helps in attaining a beginner's mind. It takes you into unexplored avenues of love and struggle and on to the roads less trodden. While practicing it, many things will come on the way, and many thoughts will knock on your door and ask to be your guest, but you do not have to serve them tea.

and ignore the huge expanse of knowledge that surrounds us. The answer to the question of the wise woman was simple, but the man's fixed ideas came in between him and the answer, thus hindering his judgement.

We learn only when we unlearn. To absorb anything new, it is imperative to create a space for it to enter the mind. A child looks at everything with the mind of a beginner and the mind of the beginner is free of the phrase 'I know'.

Once a glass jar was kept in an exhibition with a stone inside it. Each of the attendees was asked to write down what they saw first when they looked at the jar. Fifteen people took part in this experiment and noted down their observation. One among them was an eight year old child.

Dear readers, you must also imagine a jar with a stone in it, and tell us what you observed.

14 of them wrote that they saw a stone in the jar. However, the child wrote, "I saw the glass first."

Most of us are like those adults who do not see the shining glass before them. The child had a free, but focused mind. His focus was only on the question, he did not add meaning to his thoughts. He processed what was asked and wrote what he saw.

The mind of the child, or you may call it a beginner's mind perceives quickly as it is not a hoarding ground of thoughts and predetermined ideas. Children see possibilities, not hurdles. They see opportunities, not barricades, they see success not losses. They live in the moment and embrace what life offers them.

Children who get hurt while playing may scream and cry but do they stop playing? Their wounds make them strong and they tell other children heroic stories of their bruised knees and how they overcame them. They soon forget that they were hurt and are back into action. On the other hand, an expert mind lives in their self-created shell of 'I know', and does not experience the beautiful world that lies outside of their preconceived notions.

It is important to have a mind of a beginner to learn anything, but it is even more pertinent to have this pattern of thinking when one is on the quest of self-realisation. Those who see through a set lens, do not see an object, rather they see what the lens shows them. A beginner's mind is always clear like a clean writing board, and allows everything to be written on it. A mind like that has the willingness to consider all sorts of ideas, like a child who anxiously explores a new toy.

As one stores more and more ideas, and judges them on the basis of stored information, their mind becomes narrow. For instance, let us consider that your close friend tells you that a certain person is bad. Their words referring to them as 'bad' may echo in

A Beginner's Mind

Every person thinks and speaks according to their level of understanding. When we do not listen to the ideas of others, or judge them for how they think, we miss an opportunity of seeing their life and understanding their learnings.

A learned man was known far and wide for his worldly knowledge. He loved to teach and would not miss a chance to disseminate what he knew. One day, he was travelling to another town to deliver a lecture to his students. He kept his books in a brown leather bag, but forgot to pack lunch, and water.

He was on his way when he realised that he was out of both food and water. Luckily, he chanced upon seeing an old woman who was preparing bread outside her hut.

He went to her and requested her for some food and water, and told her that he could only pay for it through the knowledge he possessed, "If you would give me some food, I will share the treasure of knowledge that I carry on my back."

However, she was no ordinary woman. Though she was knowledgeable, she did not expose her true status and hence smiling at him she said, "Sure son. Be my guest."

When the man had eaten to his heart's content, he thanked the old woman and said respectfully, "Madam, it is now my turn to share with you the knowledge that I have."

The woman said, "I will consider the amount paid, if you answer this simple question." He agreed to it.

She then asked, "When you ate the cooked food, were you eating it with the mind of the past, present or future?"

The man was confused. He had never thought about this before, and tried to recall everything he had learnt. Upon failing to remember, he opened his bag and began to read through his books, in the hope that they would steer him to the answer. The more he read, the more confused he became. Eventually, the old lady brought him some tea and asked, "What use is this education that places a barrier over your thinking?"

"Sorry?" he said perplexed.

"You are an idiot. You don't eat food with the mind of the past, present or future. You eat food with your mouth." Saying this, she left him in a quandary.

Many answers are right before us, but despite of this, they become vague for our understanding. This is because we are used to seeing things through what we know. The moment one says, "I know," it creates a barrier in their mind that keeps them away from new learnings. We assess things in the light of acquired information,

of fruit home, and break it open only when she reached there.

Ranti followed the old man's instructions. When she broke open the fruit, riches beyond her wildest imagination appeared and filled every corner of her bedroom. When Bisi returned home after spending her day with friends, she was astonished to see Ranti's room decked up in riches and became very jealous.

She felt she deserved more than Ranti and asked her about the happenings of the day. The next day, Bisi got up early with great difficulty from her bed, and with a pitcher on her head, walked to the river, hoping she would find the old man too.

Her happiness knew no bounds when she saw that the man that Ranti had described was sitting by the riverbank. Bisi walked to the man and haughtily asked him the way to the magic garden.

The old man smiled and showed her the way. He did not forget to instruct her to take a piece of rotten fruit and not any of the golden ones. Bisi dumped the pitcher and ran to the garden as fast as she could. When she reached both the trees, she thought to herself, "The old man must really think I am very stupid. Why would I pick the rotten fruit when there are golden fruits lying around me? And why should I pick only one?" Thinking this, she took as many golden fruits in her hands till she could hold no more and ran back home.

Bisi locked herself in her bedroom, not wanting anyone to see the riches she had accumulated. She threw the fruits hard at the floor to break them and instead of riches coming out of the fruit, snakes, worms, rodents and all kinds of creatures filled her room. Bisi began to shout and scream but it was too late; she had paid the price for her rudeness and lack of respect for people and their instructions.

Moral of the story:

To progress on any path, compliance to instructions is of utmost importance. When the revered Qalandar Baba Auliya (RA) began training his disciple Khwaja Shamsuddin Azeemi, he inscribed the following on a book,

"*Bismillahi al-Rehman al-Rahim. Ba Adab Ba Naseeb, Be Adab Be Naseeb.*" This translates to, "In the name of God, the most Gracious, the most Merciful. He who is well mannered is fortunate and he who is ill mannered is unfortunate."

When a child enters school and the teacher begins to teach the child the basics such as A, B, C, if the child begins to contest with the teacher as to why A is not B and B is not C and so forth, the child will never learn or progress. Therefore, one must live in compliance of instructions and maintain a disciplined life at all times, and this alone will bring in great progress on any path one chooses to walk on.

The Fruit of Obedience

"He who is well mannered is fortunate and he who is ill mannered is unfortunate."

A very long time ago in a village in Africa, there lived a man who had two daughters. Bisi was his daughter from his first wife who had died a few years earlier, and Ranti was his daughter from his second wife. Bisi and Ranti lived and played together but Bisi was very fond of bullying her younger half-sister. Ranti would run crying to her mother each time she was troubled by Bisi and sometimes would tell her mother that she wished to hurt Bisi in vengeance. But Ranti's mother was a very kind woman and told her child that no matter what happened, she should remain kind and loving towards her sister. Heeding her mother's advice, Ranti remained a good and loving child no matter how Bisi treated her.

One day, Ranti's mother also passed away and from then on, Bisi accelerated her level of negative behaviour towards her sister.

Bisi began to laze around wearing her best clothes, slept for long hours or went to visit her friends. Ranti on the other hand would wake up early, walk to the river and bring in water for the family's use. She made several trips back and forth with two pitchers, one on her head while carrying another in her arms. She continued the trips until the large pot in the house was completely filled. She then would sweep the compound with a broom made up of dried palm fronds before going on to the kitchen.

She single-handedly managed to prepare breakfast, lunch and dinner. She worked from morning to dusk and often collapsed exhausted on her raffia mat when going to sleep. She had no time to even feel sorry for herself.

One morning as she made her trip to the river, she saw a very old man sitting by the riverbank. His whole body was covered with sores and he looked like he was in a very painful condition.

Ranti went to him and asked if he was okay. The man replied that he was in great pain and that he would be grateful if he was offered some water to drink.

Ranti immediately gave him water to drink from her pot and also washed his sores clean. "My dear child you have a loving and kind heart and you deserve the best of the things in this world," the old man said. He then directed Ranti to a garden, which was just beyond the river. He informed her that upon reaching the garden she would find two trees, one bearing golden apples and the other with rotten fruit. He asked her to not touch any of the golden fruit and just take one of the rotten pieces

His older daughter put her hands around the lady's neck and said, "Granny, tell us something about your life?"

The revered lady went quiet for a little while. After a while, tears trickled down her face, and she narrated her life story:

"I was perhaps 14 years old when my parents arranged my marriage. Soon after my wedding, my husband passed away. That night, I heard my in-laws murmur that they would burn me on my husband's funeral pyre. After hearing this, I left my in-law's house in the dead of the night and returned to my parent's home. My mother embraced me. My father, however, was a traditionalist; he did not like me returning in this manner. When most of the night had elapsed, my mother secretly helped me escape from the back door of the house. I ran and ran until the sun peeked out on the horizon. I hid in the shrubs and behind trees all day, crying and sobbing, while lamenting my fate. As the sun went down, I ran again not knowing where was I heading."

"With wounded feet, frail body and parched mouth, I somehow managed to reach the shrine of Khwaja Ghareeb Nawaz (RA). I was so overwhelmed with fear and terror that I entered the shrine, locked it from inside, and laid my arms around the grave of Khwaja Sahib (RA). I suddenly entered a state of peacefulness; I felt like a two year old girl who had laid her head on Khwaja Sahib's (RA) lap as if he were my mother. Outside, people were banging on the door and screaming, 'A madwoman is inside the shrine!'

They continued to pound on the door, but I was in an entirely peaceful state, unaffected by all that noise. Eventually, when I was relieved of my fear, I opened the door. I was given the task to clean and sweep the floor of the shrine. When Pakistan was created, I migrated here along with a woman who was just like me, and who I dearly loved and respected."

The man's younger daughter asked, "Granny, who gave you our address?"

The revered old lady laughed heartily and said, "Dearie, for a person who has found their true Master, it is not difficult to find any address or location."

The man was touched by her words. Her presence lit up the entire house. It was an ambiance that could only be felt, and not described. He held her hands and kissed them as she bid them farewell. He requested her to give him a piece of advice.

At that moment, she stood still, her eyes riveted on the sky. It seemed like she was looking into the unseen. He, along with his children, in a state of rapture, continued to look at her. She then said in a determined voice, "Son! When God favours, everything becomes favourable."

***

i

Granny

"Dearie, for a person who has found their true Master, it is not difficult to find any address or location."

There was once a beautiful old lady who visited the house of a kind man. He welcomed her warmly. She looked at him and said, "Son, I had a desire to see you; I am thankful to God that my desire has been fulfilled now."

Surprised by these words, he inquired who she was and asked her name.

With an angelic smile, she said, "I have two names. One of my names is imaginary and fictitious, while the other is in contrast to the fictitious conscious."

Curious he asked, "Can names be fictitious too? Are they not means of identification?"

Staring into space in a rather strange way, she asked, "When were you given a name?"

He replied, "When I was born."

She smiled and asked again, "Are you still the same person who was born then? Hasn't every single part of your body changed? Haven't you left your cradle and now run around? Were you as tall as you are now?"

He remained silent but not for long. As curiosity took over, he asked her, "Who are you?"

She said, "I have two types of existence. One existence is affected by death in every moment and within the same moment, a new body is formed. This existence oscillates between life and death. The other existence is free from the effects of time. It is neither born, nor does it die."

Upon hearing these words of wisdom, he realised that she was a very learned and scholarly person.

As soon as he thought this, the lady said, "No son, I am not learned. I cannot even write a word. I am simply a devotee of Khwaja Ghareeb Nawaz (RA)."

"Really?" he replied in surprise and asked, "Where do you live?"

"It depends… I have two residences. One residence is enclosed within time and space, where I feel imprisoned and confined. However, in my other residence, spatiotemporal limits do not affect me, rather they are under my command."

When he heard her talk about time and space, he felt like a 60-year-old farmer who was being taught the concept of atoms.

When the revered lady saw that he became nervous, she placed her hand over his head. As her gentle hand was upon his head, his children entered the room and when they saw the old and beautiful lady, they screamed in excitement, "Granny is here! Granny is here!" She hugged all of them, as if they were her own grandchildren, and showered them with prayers.

ماہنامہ

روحانی ڈائجسٹ

کراچی

یہ پرچہ بندہ کو خدا تک لے جاتا ہے
اور بندہ کو خدا سے ملا دیتا ہے

چیف ایڈیٹر: خواجہ شمس الدین عظیمی

مینیجنگ ایڈیٹر: ڈاکٹر حکیم وقار یوسف عظیمی

روحانی ڈاک میں آپ کے مسائل و مشکلات کا حل پیش کیا جاتا ہے۔

شعور کے پس پردہ لاشعور کی حقیقت کی پردہ کشائی کی جاتی ہے۔

خواتین کی زندگی کو پرکشش، پرسکون بنانے کے لئے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

بچوں کے لئے کہانیاں اور بہترین مستقبل کے لئے راہنما اصول بیان کئے جاتے ہیں۔

دین و دنیا کی خوشی حاصل کرنے کے لئے روحانی ڈائجسٹ ہر جگہ دستیاب ہے۔

chemicals help us in regulating our emotions and mood. Owing to this, people mindlessly opt to choose the same group of food items when they are experiencing the same group of emotions.

Chinese medicine has clearly chalked out the physical imbalances that you are most likely to face when you consistently make certain type of food choices. When one chooses bitter food constantly, they are most likely facing imbalance in the energy of the heart. Sweet cravings correspond to the lack of balance in the stomach. Salt cravings point to the kidney. Spicy food choices point to the lungs, and the choice of sour foods point to discrepancies in the liver functions.

In order to differentiate between emotional eating and eating out of hunger, notice why you are reaching out for food? If the answer is, "Because I *feel* like having it," realise that feelings are related to the mind and it is emotional eating. During these urges, one needs to distract their mind by engaging it in some productive activity.

However, if one's stomach is growling and experiencing hunger pangs, this suggests signs of real hunger and one must nourish the body as soon as possible with food and drink.

The body experiences the outer world through the five doors or five senses. Contemplation plays a great role for spiritual progress. To be able to contemplate, it is very important that we ensure that we have healthy sensory organs that can send signals to our brains, which then processes the information, interprets it, assesses it and helps us perceive and form experiences.

When the body is uncared for, or we over use the senses, the body falls sick and a diseased body is unable to help us walk this path with ease and joy.

A person who suffers from disease is unable to sleep well and is most likely to suffer from sleep disorders. When a person suffers from uneven sleep patterns, they are likely to feel groggy, find themselves unable to focus on anything, irritable and moody. These people are most likely to get themselves into addictions that will give them relief from these states of sleep and sleeplessness.

People who are sick are found to have erratic schedules and remain pretty inconsistent through their day. They are unable to follow through with anything they decide upon and most often leave tasks incomplete due to their health constraints.

The body is referred to as the temple of the soul. Unless one purifies the appliance (body), the energy (soul) within will not operate in its highest form.

is important to note the various factors that affect the breathing patterns in a person.

Firstly, body weight plays a major role in affecting the pace of breath. Secondly, the emotional state of a person causes disruption in their breathing pattern.

We notice that when one is obese or overweight, they tend to breathe heavily. This is because the body is unable to cope with the pressure of the extra weight on their lungs as it has to work harder to expand itself. As the maximum pressure of being overweight or obese falls on the diaphragm, breathing becomes difficult and the body becomes slow and lethargic in processing the tasks of the organs that are surrounded by layers of fat. This is the reason that excessive weight on one's body can hinder spiritual progress.

Mr. Azeemi writes in his book '*Muraqba* (The Art and Science of Sufi Meditation)', "Eat easily digestible and simple food. In addition, be careful not to indulge in overeating. A person who eats food slightly less than his or her full appetite, feels lighter and their mental concentration remains high. From a medical point of view as well, greasy, hard to digest food and hot spices are bad for one's overall health. Avoid *Muraqba* or any other spiritual exercises when you are full. It should be done at least two and a half-hours after the last meal."

The same is the case when a person is experiencing heightened emotional states. You will find that a person who is angry, sad or in the grip of negative emotions will also be breathing rapidly and feeling heaviness around their chest and throat. This heaviness constricts the free flow of air in and out of the lungs, resulting in shortness of breath, breathlessness and other breathing disorders.

When breath is not slow and steady, one cannot achieve focus in their states of *Muraqba*. They will experience constant distracting thoughts and emotions that will pull them out of their peaceful states and overwhelm them. Leading them to very often leave their meditation practice abruptly.

In his book *Muraqba*, it is stated that, "Under the influence of emotions, thoughts, and urges, the mind is constantly changing from one state to the other. It never stays in a single state. Due to the constant influx of thoughts, we fail to perceive the stations that are the source of our origin."

To achieve states of even breathing, one must align one's self to good eating habits. Reduce the portions of food intake so that stomach is not over full.

It is known that each food type has a certain proportion of light and energy in them. These energies affect the way an individual thinks and feels. Intuitively, our body knows the chemicals that will be secreted by eating a certain group of food and these

roll over, bend down and perform summer salts with great ease. This is because, the bones of the baby are still soft and growing, and the muscles and skin are just beginning to stretch around these growing bones. If the bones were not soft and flexible, the baby would not learn new movements such as crawling, sitting, standing and walking.

As time passes, the body begins to cope with our growing up as adults and bears the onslaught of the havoc our hormones create within us. It begins to shape to match the requirements of an adult life – duties and responsibilities of marriage, parenthood, careers and so much more.

Now let us deduce the importance of the physical body in the spiritual journey we endeavour to undertake.

The most important step that aligns us to our subconscious existence is *Muraqba* (Meditation). *Muraqba* is the art of remaining thoughtless in one thought with all our focus and concentration. To achieve deep levels of focus, we need to ensure that the body is also aligned to the goal of spiritual awakening along with our mind. Let us discuss the key elements for a successful session of *Muraqba* and how the body plays a prominent role in achieving this.

For a successful session of *Muraqba*, it is very important for the body to remain still. A constantly fidgeting body distracts a meditator from their focused state and keeps them from attaining deeper states of meditation.

In order to train the body to refrain from making movements for long periods of time, it is important we discipline it with exercise. Stretching and performing flexibility exercises of the spine, knees, and legs, help a spiritual seeker sit longer in *Muraqba* without complaining of aches, pains and cramps.

Now let us consider the breath. The rhythm of our breath is of grave importance for a person who wishes to tap into their deep subconscious states of existence during *Muraqba* and recognise their soul. As Mr. Azeemi has elaborated in his book '*Kashkoal'*,

"From the spiritual point of view, when we inhale, we become closer to our inner self, and when we exhale, we are temporarily farther away from our soul. When we inhale, we become closer to the eternal existence, however, when we exhale, we feel that we are separated from the eternal existence. In other words, inhalation and exhalation form a veil between the materialistic and eternal lives. When we take a deep breath in, we establish our relationship with the eternal life, and when we let go of the breath, we establish our relationship with the materialistic world."

As we have established that the role of breath is vital on the spiritual journey of self-discovery; it

Body – The Appliance of Soul

When breath is not slow and steady, one cannot achieve focus in their states of Muraqba. They will experience constant distracting thoughts and emotions that will pull them out of their peaceful states and overwhelm them.

When we decide to go on a long trip with our family in a car, what do we do as a first step in our preparation? More often than not, we check if the car is in good order for the journey. The checklist unwinds before us. Is the car in working condition? Does it comply to the safety measures? Do we have enough supply and tools to manage an emergency while on the trip? Does it have the resources we need to cover the distance of travel? Only when all these questions receive satisfactory answers, do we plan the other logistics of the trip.

Every form of energy needs an appliance to express itself in this material world. No matter how much science confirms to us that there is a field of electrical force all around us, we are unable to harness this energy unless we let it flow through an appliance.

For example, when electricity is harnessed and flows through a bulb it becomes light, when it flows through an oven it becomes heat and so on. Until it is channeled through an appliance, the electrical energy that is available and ample in our environment remains unused.

Considering this fact, what appliance would our soul use for its expedition on earth? Indeed, the appliance of the soul is the physical body through which it expresses itself in this material world. The five senses do not acknowledge anything that is not experienced through them.

In other words, what the senses do not see, hear, feel, smell, or taste does not exist for them. All through the journey of the soul on this planet, it remains confined to the appliance called the physical body in order to interact and communicate with other creatures.

The physical body becomes the identity of the soul and it is this body that is associated with our name, personality and character. Is it not imperative then, that we take utmost care of our body, that is gifted to each one of us by God Almighty and keep it healthy?

Our body has been with us from the very first day of our inception and has been constantly changing, growing, transforming and adapting to match our actions in life. Every cell in our body is an entire archive of experiences. Each cell is a record of what we have undergone in our lives.

Our body is extremely flexible when we are infants. An infant can bend its legs and even put their foot in their mouth. They can

iii

Majestic – the castle – like building appeared on the horizon, away from the reach of the people, yet very close, guarding the people below it. It had a sense of domination or authority that covered the horizon It was something powerful, yet a part of nature, a part of the sky, a part of beauty – the creation of beauty, a part of the highest kingdom of beings.

“She’s almost here!” The bright-eyed woman remarked, dusting off her clothes.

“She will be so happy to see us,” another woman with similar features yet more motherly looking, joined in.

“It will take some time to recover,” the bright-eyed woman turned to speak to the motherly woman.

“There is so much more here than there ever was... reality starts from here, awakening embarks from here,” the motherly woman replied.

“If only they knew...” the bright-eyed woman sympathised.

“Just a few more minutes.” The motherly woman sat on a rocking chair, awaiting the presence of her beloved.

“She’s here! She’s here!” The bright-eyed woman ran to the door.

A short woman of similar features and bright eyes, stood surprised at the front door of the little cottage.

“Dead?” the short woman asked, surprised to see her sister as she hung a garland around her neck.

“Alive, Laura. Alive.” The bright-eyed woman guided her sister to her new home.

On the Day I Die …

On the day I die, when I’m
being carried towards the
grave, don’t weep.

Don’t say, He’s gone! He’s
gone. Death has nothing to
do with going away.

The sun sets and the moon
sets, but they’re not gone.
Death is a coming together.

The tomb looks like a prison, but it’s really release
into union.

The human seed goes down
in the ground like a bucket
into the well,

It grows and comes up full
of some unimagined beauty.

Your mouth closes here,
and immediately opens with
a shout of joy there.

—Maulana Jalaluddin Rumi (RA)

the hospital, while the son was at home," whispered some within the crowd.

"First my mom, then my aunt. Two deaths in one month." A bright-eyed man stared at the lowering coffin with tear-filled eyes.

Soon the coffin was buried and the crowd dispersed. A garland of flowers rested on the fresh grave, the smell of roses permeated through the air.

'Laura Stevens' the gravestone read. 'Loving Mother and a Humble Wife.'

A few miles away however, there existed a different dimension of emotions.

"Bring the highest quality of food," a woman ordered a petite boy. "Did you invite all of our relatives?" She asked the boy again as the spark in her eyes brightened.

"Yes, I invited them all," the petite boy smiled. The excitement of what was to come was evident in both their eyes.

"Everything has to be perfect. It has been so long." The woman examined the small rooms and continued, "I made the garlands when I heard the news. I hope she likes them." She lightly stroked the flowers.

The twilight draped in through the windows, and the air seemed fresh – new even. A carefree whirl escorted the twilight that settled in with a tinge of celebration and a wind of happiness. There was something in the air, a bliss of sorts. There was a feeling of contentment, satisfaction, an eternal happiness that never left.

Outside, the grass was dark green, and even the soil seemed to be enriched with colour. The sky hosted a blend of hues too, all brightly shining through the invisible sun. There was peace among the houses, a sense of safety, and serenity. The neighbours had a shared sense of happiness for the arriving newcomer.

"Congratulations!" an amiable neighbour exclaimed, seeing the bright-eyed woman preoccupied with decorating the exterior of her little cottage.

"To you too, to you too!" she said in response.

The grass outstretched to the very end of the land, lost to common sight. There were no trees in the vicinity, only grass and flower beds that gave rise to an enchanted gust of fragrance in the air. The weather was neither hot nor cold. It was just right, mild enough for the flowers to blossom and for the grass to remain erect.

A colossal building stood suspended in air, ethereal walls of green and grey standing guard. A golden light lit the enormous pillars of white; made from clouds or cotton one would think, some tall and wide, some spiral-shaped and some vanishing halfway.

Arrival

Soon the coffin was buried and the crowd dispersed. A garland of flowers rested on the fresh grave, the smell of roses permeated through the air.

The food sat warmly on the glass table with the cutlery arranged neatly beside the crockery. The watery gravy breathed its last as the cold December morning swept in to seize its weary breaths. Death. Not a particle moved at this very hour. The drapes hung in sorrow, the rug lay lifeless, and the windows muffled the weeping wind. The silence in the room was deafening itself, the coldness of December encaged the very room; the once warm, content room, was now hunted by sorrow. The once merry ambiance sat in grief.

The organised dining hall silently mourned the absence of people. The chair which had been occupied minutes ago stood shyly in the corner, away from its table, away from its family of chairs - misplaced, yet silently grieving.

The ambush of its occupant had left it bewildered, barely balancing itself, barely controlling its flailing emotions. The wood creaked in shock, the legs screeched in pain, yet the pain of the occupant had been far greater. The pain of the occupant had been irrevocable. The news struck like a dagger, the occupant; rushing out of the room as the clock ticked its last minutes.

The spoon shouted as it met the cold floor, and the gravy splashed its tears, incapable of withholding them. Moments ago, the room had been a hospital of noises – of shock, horror and pain, and the occupant had left, abandoning it to silence, to solitude, to be haunted by the merry memories of the past.

A tear trickled from the eye, passaging from eyelashes to cheek, slipping to the jawline and falling reluctantly to the ground.

"When will it arrive?" Hushed voices spoke to themselves.

"I received the news in the morning," one female whispered to another.

In a matter of minutes, people silently trickled in, person by person - a graveyard of people, silently mourning the loss of what was once living. The house, soon enough, was filled with the din of incoming people; an enforced hush roamed the halls, a repressed colloquy echoed through the crowded rooms. Narrowed eyes, glum expressions, a forceful purse of lips; death was being met with disgust and despondence.

Loud sobs could be clearly heard from the graveyard, as a crowd of people encircled a grave ready to be filled.

"She was a good soul," they said as the coffin was lifted, moments before being lowered into the grave. "Died of heart failure in

Fragrance is Life

Once upon a time, there was a flower shop in a jungle; it was owned by Ms. Butterfly. Her shop had many flowers, scents, medicine and sorts of honey. One day, Mr. Bear came to Ms. Butterfly's shop and said, "I am hungry, please give me honey."

When Ms. Butterfly gave him honey, Mr. Bear laughed at her as he saw the medicine she had on display. He asked, "Why do you have medicine in a flower shop?"

Ms. Butterfly replied, "When you went hunting for food, your little baby bear hurt his eye. Ms. Bear called me to help her out. I rushed to them and put rose medicine in his eye. Flowers are used to make medicine too, Mr. Bear."

Mr. Bear passed a sheepish grin and left the shop, enjoying his honey.

In the evening, Ms. Butterfly went home. Her children gathered around her. "What will be the theme of our birthday party?" they asked.

"It will be flower themed." Ms. Butterfly told them.

The next evening, Ms. Butterfly called all her friends for a birthday party. Everyone helped her with the arrangements for the party. Mr. Bear gifted a rose cake to the baby butterflies. Ms. Queen Bee came to the birthday party also, and they cut cake and played many games. First off, they played a game where they wore blindfolds and were made to smell scents and guess what flower it came from. There were six flowers that had their scents extracted and kept in bottles. These were rose, lily, sunflower, daisy, tulip, and lavender.

Ms. Queen Bee brought goody packs for the children. She asked them all questions about flowers. She asked them how many parts a flower has.

Baby Sheep answered that a flower has four parts: The Petal, stamen, sepal and carpal.

Everyone clapped for Baby Sheep and Ms. Queen Bee gave them a goody pack. She then asked, "How can we serve flowers?"

Little Sparrow answered, "We should water them, love them and not pluck them. When we love flowers, their fragrance grows stronger and stronger." Everyone clapped for Little Sparrow.

Ms. Queen Bee then said, "Fragrance is the life of flowers and life is the light of God. God made everything with His light."

Iffat Mehmood — Class II

◊ Notice what is in the environment that pushes you into obsessive thinking. For example, if it starts when you are alone, get up and remain in the company of people until the thought vanishes.

◊ Perform meditation – by focusing on one positive thought, you break the pattern of obsessive thoughts.

◊ Seeking help from professionals to resolve your problem is also a good idea if you cannot find solutions on your own.

◊ Become more aware about what produces fear and worry in you.

◊ Meet people who have similar problems and kick start a mutual support group.

◊ Offer gratitude every day to at least ten things. You have to push your mind into a state of celebrating the positives around you instead of brooding over the negatives.

◊ Stand in front of the mirror and repeat positive affirmations that give you hope and motivation. For example, say, "I am amazing. I am having a positive day. I resolve all my problems effortlessly. I am surrounded by positive thoughts. I am an inspiration to myself and others."

◊ Think of one positive memory and write about it in detail.

◊ Spend a lot of time in nature.

An Example for Every Son, a Hope for Every Father

A son and his elderly father were in a restaurant. His father was frail, and could not walk without support; therefore, while eating, he dropped food on his shirt and trousers, and some of it even dripped off his lips.

Other diners felt uncomfortable, and showed disgust. However, the son was busy talking to his father calmly, with no tinge of embarrassment on his face.

After they finished eating, the son wiped his father's mouth with a handkerchief, picked off food particles from his clothes, and cleaned his hands for him.

The entire restaurant had forgotten to eat their own meals, rather, they looked towards the son and father in disbelief.

The son tipped the waiter, and then helped his father walk out of the restaurant. One of the diners, an old man, called out to the son and said, "You have left something behind."

The son looked towards the table they just dined on and replied, "No sir, I haven't."

The old man replied, "Yes, you have. You left an example for every son and a hope for every father."

The son slightly nodded his head, smiled, and then left the restaurant, which was engulfed in silence.

- They think that by thinking about the problem, they are moving towards a solution.
- Life threatening illness.
- Problematic digestive tracts that can cause obsessive thinking leading to irritable bowel syndrome.

Prolonged obsessive thinking habits can lead to:

- Procrastination or postponing doing things.
- Fear of doing things which leads to doing nothing.
- Perfectionism or constantly verifying what has been done over and over again as correct.
- Lack of self-confidence and self -worth.
- Prolonged states of emotional distress or depression.
- Erratic spikes of anger, rage, or tears.
- Rebellion or extreme withdrawal from society and people.
- Insomnia or sleeplessness.
- Over or underweight issues.
- Impaired thinking.

Psychologists have asserted for decades that there is a huge difference between just having a negative thought, and taking steps to act upon it, yet we never seem to learn from this. One must understand the impermanent nature of thoughts and that they are just fleeting mental images. They have no consequences until one chooses to give them attention, letting them linger on and giving them importance. Let's look more closely at the choices that will help you prevent the pattern of rumination and hence, the act of spilling toxicity into your life.

◊ Accept the thought and stay in deep awareness of it. Do not try to suppress it.

◊ Try to move away from the situation by engaging in an activity that you like. Such as, exercise, cooking, painting, reading, gardening, etc.

◊ Loudly address yourself to stop ruminating, or say ‘enough’.

◊ Share the repeated thoughts with only those who will help you focus on solutions and bring healthy alternative perspectives.

◊ Practice deep relaxation techniques like deep breathing, gently massaging your temples and forehead.

◊ Write the negative thoughts on a piece of paper and write a new perspective of the same situation.

◊ Take a tiny step towards the solution. Make those steps that are possible with achievable solutions.

◊ Identify the common negative feeling behind the thoughts. For example, they could all be about falling sick or being rejected or the worry of losing your loved ones.

in a whirlpool of thoughts that are spinning at an overwhelming speed.

Reflection and Rumination:

There can be two ways of dealing with any thought of distress. In the first method, we focus on the solution. In the second method, we focus on problem. When we focus on finding a solution, we are pondering over possible reasons and outcomes and how to get a head start on a resolution; this is part of normal human behaviour and is termed as a process of reflection. In fact, this is how experience and strength of character is built over time when one is repeatedly problem solving.

However, when people cannot shift their focus from the problem itself and dwell upon the, "Why did it happen? How did it happen? Why did I say this? How could they talk the way they did?" The mind begins to ruminate.

Rumination in general, and brooding in particular, is all about being in a negative mood. The mind replays past events till it generates stress and anxiety instead of being constructive and solution oriented. In this state, the mind dwells on the injustice that occurred, the things that one should have said or not uttered, or what they could have or should not have done, without any corresponding action to resolve these issues, which pushes the person into deep states of distress and worry. In other words, the mind is preoccupied with mistakes, losses, action and inaction, opportunities lost, and people who have left. The most common feelings associated with the above are judgment, criticism, grudge, anger, regret, guilt and shame.

When an anxiety disorder becomes intense and stays over prolonged periods of time, they interfere in one's daily life. An affected person is constantly gripped in the feelings of fear and doubt. When a person stops questioning their thoughts and accepts them, they become pathological.

For example, let us consider a mother who is constantly thinking that her child may meet with a fatal accident, and these thoughts arise in her without any provoking situations around her. If the mother puts the thought aside then she has curtailed it, but if she decides to dwell on it, then over time, it will lead to an Obsessive-Compulsive Disorder.

Let us understand some common trigger points that cause obsessive thinking patterns:

- Failed relationships.
- A traumatic event or tragedy.
- Perfectionism.
- Low self-esteem.
- Performance anxiety.
- Phobia or fear (e.g. the fear of water or heights).
- Awaiting results of a life changing test (e.g. a job offer or a loan approval).

i

Obsessive Thinking

One must understand the impermanent nature of thoughts and that they are just fleeting mental images. They have no consequences until one chooses to give them attention.

Obsessive thinking is when one is unable to control one's self from falling prey to recurring, and distressing thoughts of fear, worries and anxiety. These thoughts can be in the form of disturbing imagery if the person is very imaginative. In other words, the person can create an entire sequence of event that disbalanced them in a loop of images that plays over and over again in their mind. Obsessive thinking can range from mildly distracting to intensely gripping, where one forgets everything else that is around them.

Obsessive thinking is often woven tight within feelings and sensations, such that one can feel the event of the past as though it were unfolding right in front of them. The continual habit of obsessive thoughts goes on to be a behavioral issue over time. Brain imaging suggests that this is a neurological dysfunction that forces thoughts into repetitive loops. This pattern of behaviour does not allow a person to remain in the present moment and creates constant stress and anxiety.

When one is in the grip of obsessive thoughts, the adaptive process breaks down and the mind is stuck on an endless process of trying to figure it out. The mind is plagued by various disastrous outcomes that may never occur. When worries and problems become clearer than the solutions, one begins to fret about the futility in making things work out.

Obsessive thinkers are those who replay situations and outcomes in their head. For example, if they message a friend and the friend does not reply for over two hours, they begin to assume negative causes and start thinking of negative thoughts that will justify the lack of response from the friend. Thoughts such as, "Did I hurt my friend in anyway?" or, "Maybe they found someone better than me to talk to?" or, "Am I boring them and now they're fed up with me?" or, "Why does everyone dislike me so much?" and so on. This habit of playing and replaying various scenarios and outcomes to a situation over and over again is an obsessive thinking pattern.

You may notice some people who repeatedly obsess over cleaning their hands. This is because they have an Obsessive-Compulsive Disorder (OCD) that makes them feel that their hands are constantly dirty and need washing. The mental images of their hands being dirty continually plays in their mind uncontrollably. It feels as though they are trapped

Junayd al-Baghdadi (RA), who was influenced and hypnotised by Satan. The disciple said that each night, a giraffe came to his house and claimed to be an angel. The giraffe then took him to heaven where it served him a variety of fruits. He happily narrated these incidents to Hazrat Junayd (RA) who replied, "Tonight when that 'angel' comes, recite a particular Quranic verse after you reach 'heaven'".

Upon reaching 'heaven,' the disciple recited the verse, and immediately came out of the effects of the hypnotism and saw that his ride was in fact a donkey, and the place he had thought was heaven, was in fact a pile of dump.

The moral of the story is that fiction, which is actually a vision that is under the influence of doubt and change, not only deceives people but also shows them deception.

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) once visited Sheikh Kher Nisaj while he was busy. A thought struck him that Hazrat Junayd (RA) was waiting for him at the door, but he ignored it, considering it to be a mere thought. He felt the same thought again and continued to ignore it. When it happened for the third time, he went to check his door, and saw Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) waiting. Hazrat Junayd (RA) asked him, "Why did you not come on the first thought?"

Sheikh Kher Nisaj was speechless hearing this.

Hazrat Junayd (RA) loved one of his disciples very much. This gave rise to jealousy among other disciples. Feeling this, he said to them, "The place one holds in my heart is due to their wisdom, hence others should not envy any other person."

The disciples did not understand this however. Therefore, Hazrat Junayd (RA) gave each of them a rooster and a knife, and asked them to sacrifice the rooster in a place where nobody could see them.

After some time, they all came back with a sacrifice except for the disciple who he loved the most, who came back late in the evening with a live rooster and said, "I could not find a place where there was no one. Wherever I went, I found God Almighty watching over me."

This event signifies two different patterns of thinking. One disciple sensed the presence of God at all times, while the others were too busy in themselves.

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) left this world on 27th Rajab, 297 A.H. His tomb resides in Baghdad.

* To ignore means to not see despite seeing.

and where he was going."

After 3rd Hijri, Hazrat Junayd al-Baghdadi's (RA) circle of followers began to grow. This made some people insecure who then decided to speak to the Caliph of Baghdad. The Caliph was also afraid but did not want to earn the opposition of the public by causing direct damage. Therefore, he came up with a strategy, and chose a very beautiful and educated maid.

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) was informed that the maid of the Caliph of Baghdad wanted to see him, and he granted her permission.

The maid came forward and found him immersed in deep thoughts. Seeing him inattentive, she tried to seek his attention, "O young man! I have been standing here and watching you for a long time now. Glance towards me, for God has created me too."

He ignored* her and said, "Indeed the beauty of my Lord and His Mercy is present in every creation of His in this universe, and I look at everything in this way. There is nothing here but God's remembrance."

The maid replied, "If this is so, then fine! I ask you from God. No one has ever returned empty-handed from the court of God."

Hazrat Junayd (RA) replied, "That is true, but at this time, it is better for you to return empty-handed."

The maid wanted to say something more, but he stopped her. "Do you think I am ignorant? Indeed, God is nearer than one's jugular vein. I have heard the Caliph's conversation by the command of God. The Caliph wants to behead me but it should be known that I am under God's protection."

Having said this, he looked in her direction. The moment he looked towards the maid, she could not bear it and collapsed.

As soon as the Caliph heard of this, he visited Hazrat Junayd (RA) and said, "You killed my beautiful maid with your practices."

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) replied, "I did not kill her. She wanted me to look towards her, whereas only God's remembrance resides in my heart. So, when I looked at her, she could not stand it. It was all according to the will of God. He saves the one whom He wants to save, and who can save the one who comes under His wrath?"

The Caliph replied, "Why did you forget that God is the most Merciful?"

Hazrat Junayd (RA) said, "Indeed, He is the most Merciful. It is His Mercy that you are safe despite your evil intent. It is better for you to return to your dark house, which has not been reduced to ashes yet." The Caliph trembled upon hearing this.

There is a famous incident regarding a disciple of Hazrat

from anyone, except God. Such a person is never left hopeless.

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) was leaving a mosque when an old man approached him.

He asked the man, “Who are you?”

The man replied, “Iblis (Satan).”

Hazrat Junayd (RA) looked closely at the man and asked again, “O Iblis! What prevented you from prostrating to Adam (PBUH)?”

Iblis sighed and said, “God is One. I did not like prostrating to anyone other than God. I am the greatest believer in the Oneness of God amongst the creations.”

Hazrat Junayd (RA) then asked, “Tell me, whose servant are you?”

Iblis replied, “I am the servant of God.”

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) said, “No servant of God would dare disobey Him. If you truly loved God, how did you violate the command of your Master?”

Iblis screamed in excruciating pain and said, “O Junayd! You have burnt me.” Saying this, he disappeared.

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) narrates an incident, “Once I had indescribable anxiety during late-night prayers. I engaged myself in *zikr (the remembrance of God),* but the uneasiness persisted. I paced inside the room for a while, but my condition remained unchanged. I could not understand the cause of this unrest, so I went outside in the open air.

“I had walked a short distance when I saw a man in a cloak. I wondered who it could be and approached him.

The man said, ‘You took very long to come!’

I enquired, ‘Who are you? We had no commitment!’

The man replied, ‘This is true but I had prayed to God Almighty, the One who stirs and listens to the heart, to inspire you and bring you to me.’

I replied, ‘Indeed! God has turned my heart towards you, and here I am!’

The man exclaimed, ‘I seek an answer! This question has been bothering me for many days. Please tell me, when does the disease of the ego become a remedy in itself?’

I replied, ‘When man leaves his selfishness, then the disease of the ego becomes the remedy.’

Upon hearing this answer, the man spoke to his ego and said, ‘I told you the same thing seven times, but you did not listen to me, and kept insisting that you would not follow my advice until you heard it from Junayd. Have you heard it now?’

After saying this, he left, and I stood there wondering who the man was, where he came from,

everything, but keep secrets. They dislike backbiting and instruct disciples to refrain from it too.

Once, Hazrat Junayd al-Baghdadi's (RA) shoes were stolen. As he was passing by the market, he saw a man trying to sell his shoes. One of the buyers asked the man, "What proof do you have that you own these shoes? I will buy them if you prove them to be yours."

Before the thief could speak, Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) intervened and said, "They do belong to him, I am aware of it." The customer then bought the shoes.

Hazrat Junayd al-Baghdadi(RA) narrated that during *Hajj*, it was his routine to visit the *Kaaba* (House of God) late in the night and perform circumambulation. One such night, he found a woman reciting couplets as she was circumambulating:

I tried to conceal my love in all possible ways, and failed.

Now it has a permanent abode in me.

When the quest accelerates, the heart grows restless in my Beloved's remembrance.

I want to be close to my Beloved, and He becomes closer to me.

I have annihilated myself for Him, and then go on to live once again for Him.

I am ecstatic in His love and nearness.

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) asked, "Do you think it is appropriate to recite couplets such as these in such a holy place?"

The woman looked towards him and said, "Junayd, I am immersed in the love of God and His love astounds me. Tell me! Do you circumambulate God or the *Baytullah* (House of God)?"

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) replied, "I circumambulate the *Baytullah.*"

The woman looked up at the sky and said, "All praises to you God! All praise to your Glory! The creations made of stones circumambulate the stones, and those with understanding circumambulate the owner of this place. Had they been true in their love for You, their own attributes would have disappeared."

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) was overwhelmed with ecstasy and became unaware of his surroundings. When he regained consciousness, the woman was no longer around.

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) says, "God demands two things from his servants; to know how to worship, and to ponder upon His creation."

Worshipping is defined as,

"I bare witness that there is no god but God. He is One, and has no partners. And I bare witness that Muhammad (PBUH) is His servant and messenger."

The right pattern of thinking is that one must not expect anything

a reflection of the environment that is given to them.

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) took spiritual allegiance under his uncle, Hazrat Sirri Saqti (RA). One day, his uncle said, “Son, you are intelligent! From where did this ability come to you?”

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) replied in obedience, “God Almighty has been benevolent to me by the grace of your training and love.”

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) studied from several other teachers as well, including Sheikh Abu Thawr (RA), Sheikh Abu Abdullah Mahasi (RA), and Sheikh Abu Hafs al-Haddad. (RA).

Eventually, Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) began to impart education and training to others following the orders of his spiritual teacher, Hazrat Sirri Saqti (RA). The main subject of study was *Tasawwuf* (spirituality).

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) says, “Spirituality is a subject which matures the soul, and brings a creation closer to their Creator. The seekers of this path see God through their spiritual experiences, and if God desires, He converses with them directly.”

There are two aspects of knowledge: Worldly and spiritual. The worldly knowledge requires paper, a pen and other resources; whereas spiritual knowledge is transferred heart to heart, from a spiritual master to the student.

With the knowledge of *Shariah*, seekers find the truth, and *Tareeqat* (spirituality) leads to the understanding of this truth and reality. Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) says that both of these are aspects of the same branch of education.

“To stay away from ill manners, and to develop good morals is spirituality. The knowledge of spirituality is not outside the Quran and sunnah. One who has not read and understood the Quran is not qualified to speak on spirituality.”

In the early days of his training, a person asked Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) for something. Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) thought it was inappropriate for the man to beg, as he was capable of earning a living. He later expressed these views of his about the man to someone else.

That night, he had a dream where he saw the same man lying dead before him.

He found himself being ordered to eat the dead person.

He replied, “I cannot eat him.”

The voice said, “Why did you eat him then?”

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) immediately woke up from his dream, and realised that he had backbitten the man, and in order to correct his thinking, this was pointed out to him through his dream.

Friends of God are aware of

i

Restlessness

"I could not find a place where there was no one. Wherever I went, I found God Almighty watching over me."

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) was named after his grandfather, Junayd Qawariri. His ancestors migrated from Nihawand and settled in Baghdad. His father was a glass merchant who followed the *sunnah* (traditions) of Prophet Muhammad (PBUH) in trade, and was considered to be amongst the elite men of Baghdad.

When he turned five years old, his father started taking him along to their shop. He concentrated and absorbed experiences on how the matters of trade were carried out. His intelligence was not hidden from people; however, no one knew that the heart of the child who sat in the mirror shop was clearer than the mirrors he sat amongst, and that he would polish hundreds of hearts later on in his life.

Hazrat Junayd al-Baghdadi's (RA) family was distinguished in art and knowledge. His maternal uncle, Hazrat Sirri Saqti (RA), told his sister and brother-in-law, "God manifests His unparalleled powers as He wills; with the will of God, this child will become what I see in him."

One day, Hazrat Sirri Saqti (RA) sought permission from his sister and her husband to keep Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA), his nephew, with him for some time. The parents, being aware of the purpose behind this request, granted him permission. Hazrat Sirri Saqti (RA) then educated Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA), and imparted spiritual knowledge to him. After Hazrat Junayd al-Baghdadi's (RA) father passed away, he was left completely under the supervision of his uncle, who took care of all his needs.

Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) often observed silence for long periods of time. Hazrat Sirri Saqti (RA), being aware of his nephew's situation, would leave him alone in these periods.

When Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA) was about eight years of age, he travelled to perform *Hajj* (Islamic Pilgrimage) with his uncle. There, he attended a scholarly gathering where the topic of discussion was gratitude.

Hazrat Sirri Saqti (RA) said to him, "Son! Express your opinion too." The attention of the people in the meeting was immediately drawn towards Hazrat Junayd al-Baghdadi (RA).

He said, "The definition of gratitude is that when God Almighty bestows one with a blessing, they should make use of it with happiness, and should not disobey God by being thankless." He was praised by all the attendees.

Dear readers! Every child is able and intelligent. They become

force of *Noor* (Divine Light), and under the shadow of these stars, one's mind aligns with the manifestations of nature. The union of the twinkling stars create the ambience of a wedding procession, and this spectacular sight leaves one thinking about the Creator of these manifestations. Remaining immersed in the thought of the Creator makes one's conscious mind submissive to the subconscious mind.

We consider the movement of the physical body as the universe. However, the physical body, which is a combination of flesh and bones, is made up of matter. Matter cannot move on its own, therefore, the physical body is incapable of creating movement by itself.

What is the source of movement then? If one considers the movement of a physical body as life, then why does this body lose its identity after it is buried in the earth? The physical body is made of dust, and eventually turns into particles of dust, but the life in these particles does not end. Those who spend their lives in understanding the reality of things witness the world deeper than the surface level of earth. Such people are known as *Auliya Allah* (Friends of God).

> "And verily in the heaven We have set mansions of the stars, and We have beautified it for beholders. And We have guarded it from every outcast devil." (Quran, 15:16-17)

Respected readers! Read the following sentence over and over again. *The Friends of God neither fear nor do they grieve.*

I would like to write a few more sentences with your permission. My dear elder, and younger associates; I regard you with the highest respect. God has blessed you all with intellect and wisdom. You have been through higher education, and earned qualifying degrees by using this wisdom. In this case, should you not contemplate this verse?

> "Lo! Verily on the friends of God there is no fear nor shall they grieve.'' (Quran, 10:62)

It sometimes happens that a person comes across their record of deeds in which they find nothing but fear, grief, errors, and ignorance. Before sleeping at night, in the darkness that prevails in the room, ignore all other thoughts, and centre your mind upon this question, "Have we not covered ourselves with layers of grief, sadness, and fear?"

May God Protect you.

Note: Pay great attention to the article you have read above, and let us know how many verses of the Quran have been explained within it.

zones where they form clouds and become the source of rain. If God so wished, He could turn that same water into a storm, so why do you not show gratitude?

If what I have written here was not displayed on the screen of my mind, would I have been able to write it down on paper? Would you have been able to read these thoughts, if I had not penned them? Can words be memorised if memory cells become dysfunctional? If all resources are available but one's mind does not function, will they be able to draw out the meaning from this article? The answer is – No. No. No!

• • ———————— • •

Dear elders, and my sincere friends! I have written what circumstances have propelled me to write. You are well aware of the fact that there are many secrets hidden in what I have written. If they were to be unveiled, and explained in detail, we would run out of pages.

What you need to understand is that God has created hundreds and thousands of worlds. It is said that the moonlight is a reflection of sunrays. The sunrays, which cool down and transform into moonlight, bear fruit that encapsulate innumerable benefits. If you read this writing with profound contemplation, God willing, it will introduce you to numerous dimensions. Contemplate it, and make efforts to understand what is shared. God has emphasised upon the act of contemplation many times in the Holy Quran in different words. For example:

”تعقلون، تعلمون، یعلمون، تذکرون، تفکرون، یبصرون، تبصرون، یا اولی الالباب، فھل من مدکر،

فبای آلاء ربکما تکذبان، لولو والمرجان، کل یوم ھو فی شان۔“

During a period of my training, my spiritual master, Huzoor Qalandar Baba Auliya (RA) told me that the Holy Quran comprises of three main topics.

1. History
2. Society and Livelihood
3. *Illiyeen* - *Sijjeen* (The Good and Bad Deeds)

What is *Illiyeen* and *Sijjeen*? It is a book, which contains a record of the good and bad deeds, and is witnessed by those nearest to God.

• • ———————— • •

Besides the people nearest to God, every person has awareness of the universe to a certain extent. Whether it is a zone of sky, the zone of earth, or the space in between them, they are aware of these zones according to their capacities of understanding.

While sleeping under the sky on a dark night, one suddenly wakes up and look towards the sky covered with glittering stars. In the binding

in mind the verse in the Holy Quran that mentions how there are two facets to every action, we can come to the conclusion that the writing on the first page of the leaf are the commands of God sent through the Prophets (PBUT). Contrary to this, the text written on the other side of the leaf consists of disobedience to the Divine teachings; and disobedience is disliked by God.

• • ——————— • •

People think that they do a great favour by feeding a hungry person, and harbour expectations that their favour will be repaid someday. When these expectations are not met, they consider this response as an act of ingratitude, and say to themselves, "It was I who fed them when they were hungry. They are such ungrateful people!" This pattern of thinking is against the law of nature, and brings forth many questions.

- Where did the food which you offered someone to eat, come from?
- Who cultivated the lush fields on earth?
- Who made the sun rise to ripen the crops?
- Who made the moonlight a source of sweetening for fruit?
- Who nailed the mountains on earth when they were trembling?
- Who spread the earth out like a field that protects and nourishes the seeds in its womb, and offers fruit on its surface?

When you feed others, always think about who has given you these provisions? Who feeds you? Who provides water, air, gases, sunlight, moonlight, and other resources that help in cultivation? What of the womb of the earth that provides the required temperature as nourishment to seeds? Who commands the sunrays that assist in ripening fruit, and the moonlight that transfuses sweetness in them? Do the creations play any role in producing these resources? None whatsoever.

God has drawn our attention to contemplate these affairs in many ways in different verses. For example:

"Do you ever ponder on whether it is you who creates a baby from sperm, or I who creates it? When you sow seeds, is it you who makes them grow into fields or is it I who does it? If I wished, I could reduce the fields to rubble. Have you ever looked at the water you drink? Have you brought it down from the clouds, or is it I who pours it? Have you pondered upon the fire that you kindle? Is it you who created its origin, or is it I who sparked it?"

The tides of the sea always rise and fall. Often, the waves collide with each other with such force that they lift up as high as 20ft or more. Heat changes water into vapour and the air transports this vapour to cooler

Message of the Day

The universe is a combination of numerous worlds that are beyond count. Some of these worlds are known while others are unknown, but life exists on all of them. Their inhabitants travel across these worlds incessantly, experience a myriad of emotions, and are part of occurrences that are similar to one's daily life. They go through the feelings of happiness and sadness, grief and joy, serenity and stress, affection and estrangement, like and dislike, and also experience the life of wakefulness and sleep. They perform, feel, and witness the same actions and events in their sleep-life as they do in the life of wakefulness. Since all worlds are interconnected, and the actions of an individual remain associated with them, they are bound to reap the effects of the actions that they perform in their life of sleep.

Everything, and every creature experiences the same course of life as explained above. God has sent down Divine books and His messengers in all regions on Earth in order to bring awareness to the workings of the universe for the people.

The universe functions on a system of appearance and disappearance. Life and resources appear from the unseen worlds, and disappear to where they have come from. This cycle repeats itself incessantly. God has explained everything in detail in the 'Book', from the smallest thing to the biggest. He says,

> "Not an atom's weight, or less than that or greater, escapeth Him in the heavens or in the earth, but it is in a clear Record." (Quran, 34:3)

• • ———————— • •

The universe manifests itself in the form of night and day. Except for God, no one knows when this universe came into being, and no one knows whether the day and night are different or alike. Knowledge about where we were before our birth also remains unknown. Information regarding our place of birth has been passed on to us through our elders. They have told us that the place we live in is called the world, and what happens here is a film that displays onto the screen of the world.

When we consider a certain part of the time as day, we look into only one aspect of time. Similarly, when we see the opposite of day as night, we look into the other aspect of time. Understand this concept through a leaf of paper. A leaf of paper has two sides that are called pages. Just as one side of the leaf has writing on it, so too does the other side. Bearing

Contents

Message of the Day	K. S. Azeemi	172
Restlessness	Shazia Rasheed	168
Obsessive Thinking	Umar Tariq	162
Arrival	Mahnoor Arif	157
Body—The Appliance of Soul	Bibi Anuradha (UAE)	154
Granny	Fatima Zubair	149
The Fruit of Obedience	Roshan Sitara	147
A Beginner's Mind	Qasim Mehmood	145

"If you hold onto multiplicity, you are with the world; and if you hold onto unity, you are with the Truth.

— Ibn Arabi (RA)

Vol 8 Issue 11 | December 2020 | Rabi-ul-Thaany—Jumaada-al-awal 1442AH

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Monthly Karachi

Qalandar Shaoor

Neutral Thinking

(Urdu — English)

Patron in Chief

Huzoor Qalandar Baba Auliya[RA]

Chief Editor

Khwaja Shamsuddin Azeemi

Editor

Hakeem Salam Arif

Circulation Manager

Muhammad Ayaz

Furnished by Azeemi University Press. Shah Alam Azeemi, the Publisher has published it at Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Hockey Stadium, Karachi and disseminated at Surjani Town Karachi.

Rs.80/- Per issue. Annual subscription Rs.1080/- with Reg. Post (Domestic), US$ 70/- (International)

Contact: B-54, Azeemi Mohalla, Sector 4-C, Surjani Town Karachi, Pakistan. Ph: +92 (0)213 6912020